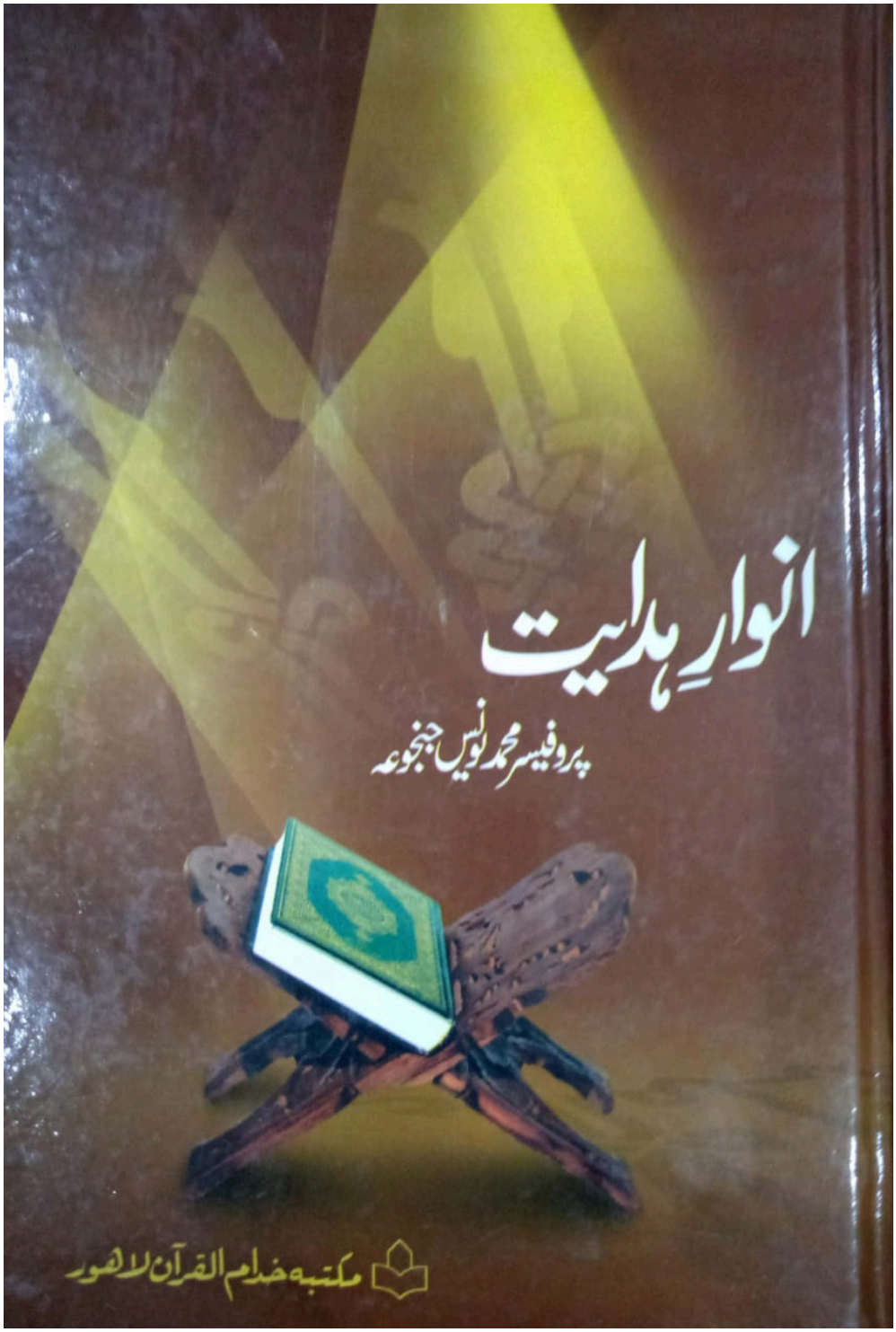

انوارِ ہدایت (حصہ اول)

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

تعارفِ مؤلف

جنڈیالہ شیر خان ضلع شیخوپورہ کا ایک معروف قصبہ ہے جہاں قومی اور بین الاقوامی سطح کے مشاہیر نے جنم لیا۔ سید وارث شاہ اسی سرزمین کا سپوت ہے جس کی تخلیق ''ہیر'' شیکسپیئر کے ڈراموں کی ہم پلہ سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کے باشندوں نے ملک کے اعلیٰ سول اور فوجی عہدوں پر کام کیا۔ مؤلف کے برادر حقیقی محمد یعقوب ضیاء کئی اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے اور چند سال قبل صوبائی سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ سابق گورنر پنجاب غلام جیلانی خان کا تعلق بھی اسی گائوں سے تھا۔پروفیسر محمد یونس جنجوعہ بھی اسی گائوں کے ایک علم دوست گھرانے کے فرد ہیں جس کے افراد نے محنت اور جہد مسلسل سے تعلیمی میدان میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔

محمد یونس جنجوعہ ۱۹۴۱ء میں جنڈیالہ شیر خان میں پیدا ہوئے۔ وہ ناخواندہ ماں باپ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ اُن کے والد فیروز دین اگرچہ کسی سکول میں داخل نہ ہوئے مگر انہیں تعلیم کے ساتھ گہری دلچسپی تھی۔ انہوں نے اپنے طور پر کوشش کر کے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ وہ صوم و صلوٰۃ کے پابند 'اپنی شرافت 'نیک نفسی اور خدا ترسی کے سبب علاقے میں مشہور تھے۔ اُن کا معمولی سا کاروبار تھا جس سے اپنے خاندان کی کفالت کرتے تھے۔ رزق حلال کمانا اور اس پاکیزہ روزی سے اپنے بچوں کی پرورش کرنا ان کی امتیازی خصوصیت تھی۔

چھ سال کی عمر میں محمد یونس جنجوعہ کو مقامی مڈل سکول میں داخل کرایا گیا۔ وہ شروع ہی سے ہونہار بچوں میں شمار ہونے لگے اور اپنے نیک نہاد اساتذہ کی خصوصی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ اُس وقت چوتھی جماعت کے طلبہ وظیفے کے امتحان میں شامل ہوتے تھے اور

یہ امتحان ضلعی صدر مقام پر منعقد ہوتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس مقابلے کے امتحان میں شرکت کی اور وظیفہ کے حق دار ٹھہرے ۔ بعد ازاں مڈل سکول امتحان میں شامل ہوئے اور وظیفہ حاصل کیا۔ ہائی سکول کی تعلیم کے لیے

شیخوپورہ شہر کے معروف تعلیمی ادارے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخلہ لیا جہاں سے میٹرک کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا۔ ناگزیر وجوہات کی بنا پر کالج میں داخلہ نہ لے سکے۔ فارغ رہنے کی بجائے انہوں نے گورنمنٹ نارمل سکول لکھڑ کی ایس وی کلاس میں داخلہ لیا۔ یہ تربیت اساتذہ کا ایک سالہ کورس تھا۔ امتحان ہوا تو پنجاب بھر کے اساتذہ میں نمایاں پوزیشن حاصل کی اور گورنمنٹ ہائی سکول ننکانہ صاحب میں سینئر ورنیکلر ٹیچر تعینات ہو گئے۔ علم کی پیاس نے انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا اور انہوں نے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کر لیا۔ بعد ازاں اُن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ لاہور ہو گیا' جہاں تدریس کے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی تعلیم بھی جاری رکھی اور پرائیویٹ امیدوار کے طور پر پہلے بی اے' پھر سی ٹی اور پھر بی ایڈ کے امتحانات پاس کر لیے۔ پھر پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم و تحقیق میں داخلہ لے کر ایم ایڈ کی ڈگری حاصل کی جس کی بنیاد پر سینئر انگلش ٹیچر کے طور پر ان کی تقرری ہو گئی۔ بعد ازاں انہوں نے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے ایم اے اسلامیات کا امتحان پاس کر لیا۔ ۱۹۸۴ء میں مقابلے کا امتحان پاس کر کے گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں لیکچرار مقرر ہوئے' جہاں سے اُن کا تبادلہ ایم اے او کالج لاہور میں ہو گیا۔ اپنی عمدہ تدریسی خدمات کے سبب ان کو یہاں سے ممتاز تعلیمی درس گاہ گورنمنٹ ایف سی کالج میں تعینات کر دیا گیا' جہاں سے وہ جنوری ۲۰۰۱ء میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر ریٹائر ہو گئے۔

تعلیم و تعلّم کے ساتھ گہری وابستگی اور دینی تعلیم کے شوق نے انہیں عربی سیکھنے کی طرف مائل کیا اور انہوں نے بغیر کسی درس گاہ میں داخلہ لیے از خود عربی زبان سیکھی۔ قرآن مجید سمجھ کر پڑھا اور مختلف مساجد میں اعزازی طور پر جمعہ کا خطبہ دیتے رہے۔ آج کل وہ جوہر ٹاؤن میں مقیم ہیں اور محلے کی مرکزی جامع مسجد کی انتظامی کمیٹی کے

صدر ہیں۔ اس مسجد میں روزانہ ان کا درسِ قرآن ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کی قائم کردہ قرآن اکیڈمی میں وقت دے رہے ہیں۔ یہ تو تھا مؤلف کا ذاتی تعارف' اب آیئے ان کی اولاد کے حالات پر ایک نظر ڈالیں۔

محمد یونس جنجوعہ صاحب کے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ امریکہ میں ہے۔ بیٹوں میں سب سے بڑے بیٹے محمود احمد محکمہ صحت میں ملازم ہیجبکہ باقی تینوں لیکچرار ہیں۔ ان کے دوسرے بیٹے مسعود احمد ہیں جنہوںنے ۱۹۸۲ء میں میٹرک کا امتحان دیا اور لاہور بورڈ کے آرٹس گروپ میں اوّل

پوزیشن حاصل کی۔ بعد ازاں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف اے اور بی اے کے امتحان اعزازی حیثیت سے پاس کیے۔ اسی کالج سے ایم اے انگلش کیا اور پنجاب پبلک سروس کمیشن کے مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہو کر لیکچرار مقرر ہوئے۔ پہلے گورنمنٹ ایف سی کالج میں رہے اور جب گورنمنٹ ایف سی کالج مشنری کو واپس کیا گیا تو گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ لاہور میں تعینات ہوئے۔ آج کل اسی کالج میں پوسٹ گریجویٹ کلاسز کو پڑھا رہے ہیں۔ اپنے مضمون میں خصوصی مہارت کے سبب کالج کی فیکلٹی میں انہیں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ایڈمنسٹریشن پر خصوصی لیکچرز کے لیے انہیں اسلام آباد' سیالکوٹ اور ملتان کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مدعو کیا جاتا ہے۔

محمد یونس جنجوعہ صاحب کے تیسرے بیٹے داؤد احمد ہیں جنہوں نے گورنمنٹ کالج شیخوپورہ سے بی اے کا امتحان پاس کیا اور کالج میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ بعد ازاں پنجاب یونیورسٹی لاء کالج سے ایل ایل بی کیا اور پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے سیاسیات کے مضمون میں ایم اے کیا اور پنجاب پبلک سروس کمیشن کے ذریعے سلیکٹ (select)ہو کر گورنمنٹ کالج حافظ آباد میں لیکچرار تعینات ہوئے۔ آج کل گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں تعینات ہیں جہاں ایم اے سیاسیات کے طلبہ کو پڑھا رہے ہیں۔

محمد یونس جنجوعہ صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے ظفر احمد حافظ قرآن ہیں۔ انہوں نے حفظ کے بعد میٹرک کا امتحان پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے دیا اور اتنے

اچھے نمبر حاصل کیے کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ مل گیا جہاں سے انہوں نے ایف اے کیا ۔ پھر ہیلی کالج آف کامرس پنجاب یونیورسٹی سے بی کام اور ایم کام کے امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیے۔ پہلے پنجاب کالج آف کامرس میں لیکچرار مقرر ہوئے اور بعد ازاں ان کا تقرر پنجاب یونیورسٹی میں ہو گیا۔ آج کل ہیلی کالج آف کامرس میں پڑھا رہے ہیں۔ اپنے مضمون میں خصوصی مہارت کے سبب کئی دوسرے معروف تعلیمی ادارے انہیں اپنے ہاں لیکچرز کے لیے بلاتے ہیں۔ اکاؤنٹنگ کے مضمون میں ایک مشہور اور مقبول کتاب کے مصنف بھی ہیں۔

خوش قسمتی کی بات ہے کہ اس گھرانے کے تمام چھوٹے بڑے افراد صوم و صلوٰۃ کے پابند' فرض شناس ' محنتی ' بلند کردار اور خدا ترس بھی ہیں۔ اپنے حلقۂ احباب میں انہیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

حافظ خالد محمود خضر
مدیر شعبہ مطبوعات، قرآن اکیڈمی

ابتدائیہ

مجھے لڑکپن ہی سے بڑے بڑے علماء کی تقاریر سننے کا شوق تھا۔ چنانچہ جہاں بھی معروف علماء کرام کے آنے کی خبر ملتی وہاں پہنچ جاتا تھا۔ یہ اسی شوق کا نتیجہ ہے کہ میں نے اپنے وقت کے بیشتر نامور علمائے دین کی تقاریر اور درس قرآن سامنے بیٹھ کر سنے۔ ان میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں: مفتی محمد شفیع دیوبندی، احتشام الحق تھانوی، علامہ دوست محمد قریشی، محمد ادریس کاندھلوی، ابوالاعلیٰ مودودی، قاری محمد طیب، احسان احمد شجاع آبادی، احمد سعید کاظمی، محمد عمر اچھروی، علامہ طاہر القادری، عنایت اللہ سانگلوی، محمد اجمل خان قلعہ گجر سنگھ، مولانا سرفراز صفدر، پروفیسر یوسف سلیم چشتی، امین احسن اصلاحی، عبدالقادر روپڑی، علامہ احسان الٰہی ظہیر، محمد حسین شیخوپوری، شیخ غلام اللہ خان، مولانا منظور احمد چنیوٹی وغیرہم۔ حتیٰ کہ گلبرگ میں غلام احمد پرویز کے لیکچر بھی سنے۔ اور حد تو یہ ہے کہ اپنے ایک قادیانی شریک کار کی دوت پر ربوہ بھی گیا جہاں اُس وقت کے ان کے قائد سے ملاقات کی اور اُس سے ہم کلام ہوا۔

یہ ۶۶-۱۹۶۷ء کی بات ہے میری رہائش اسلامیہ پارک میں تھی۔ اخبار میں اشتہار پڑھا کہ اتوار کے دن ڈاکٹر اسرار احمد A-211 این نیو سمن آباد میں درس قرآن دیں گے۔ میں اتوار کے دن وہاں پہنچ گیا۔ ایک کمرے میں چند لوگ بیٹھے تھے۔ عین وقت پر درس قرآن کا آغاز ہوا اور مقررہ وقت پر ختم ہوا۔ مجھے درس سن کر تعجب بھی ہوا اور حیرت بھی کہ ڈاکٹر صاحب کے درس کا انداز سب سے مختلف تھا۔ انہوں نے درس کے دوران کوئی غیر متعلق بات نہ کی ۔ کسی پر خواہ مخواہ تنقید نہ کی بلکہ قرآن کے ذریعے اسلام سمجھانے کی کوشش کی۔ اب تو میں ہر اتوار کو درس میں شامل ہوتا اور اپنی علمی پیاس

بجھاتا۔ جلد ہی میرا تأثر یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب کو قرآن فہمی کی خصوصی استعداد عطا فرمائی ہے اور گفتگو کا سلیقہ بھی انہیں خوب ارزانی ہوا ہے۔ سمن آباد کی کوٹھی میں جلد ہی سامعین کے لیے گنجائش نہ رہی۔ پھر لاہور میں کئی جگہ آپ کے درس ہونے لگے۔ مال روڈ کی مشہور مسجد میں مسجد شہداء میں کئی سال تک آپ کا درس قرآن چلتا رہا۔ پھر سالہا سال تک آپ نے مسجد دار السلام میں جمعہ کے اجتماعات سے خطاب کیا۔ یہ اجتماعات لاہور میں ہونے والے بڑے اجتماعات میں سے ایک ہوتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے ہاں سے ماہنامہ میثاق اور ماہنامہ حکمت قرآن جاری ہوئے جن کا میں مستقل قاری تھا۔ میں نے ہمت کی اور اپنی تحریریں اوّل میثاق میں اور بعد ازاں حکمت قرآن میں اشاعت کے لیے بھیجنی شروع کیں۔ قارئین کی طرف سے حوصلہ افزائی ہوئی تو میرے مضامین اکثر شائع ہونے لگے۔ دوست احباب کی طرف سے تقاضا ہوا کہ ان مضامین کو نظر ثانی کے بعد کتابی صورت میں یکجا کر دیا جائے۔ چنانچہ اُس کے نتیجہ میں شائع شدہ مضامین کو پرانی فائلوں سے نکالا گیا۔ ان کو پڑھا اور معمولی حکم و اضافہ کے ساتھ یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے ۔ میرے تمام مضامین میں کسی اختلافی بات کو نہیں اچھالا گیا ۔ بلکہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس پر قرآن و سنت اور سیرت صحابہؓ سے دلیل دی ہے کیونکہ اسلامی تعلیمات کے بنیادی ماخذ یہی ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت سے مقصد نہ تو نام و نمود اور نہ پیسہ کمانا ہے۔ بلکہ یہ کوشش حصول رضائے الٰہی ‘ دین کی خدمت اور صدقۂ جاریہ کی نیت سے ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ شرفِ قبولیت سے نوازے۔ میری لغزشوں‘ خطاؤں اور گناہوں سے درگزر فرمائے اور اس کتاب کو بہت سے لوگوں کے لیے نافع بنائے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ اگر کہیں کوئی غلطی دیکھیں تو راقم کو مطلع کریں تاکہ اس کی اصلاح کر دی جائے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کیا جائے۔وَ مَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ

طالب دعا ‘

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

میرے ابّا جان

ایک سلیم الفطرت انسان

نام فیروز دین تھا۔ والد کا نام فضل دین۔ ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ والد سکول ٹیچر تھے۔ ان کا سکول گھر سے میلوں دور تھا جہاں ہر روز پیدل آتے جاتے تھے۔ میرے والد دو بھائی تھے۔ بڑے بھائی کا نام مہتاب دین تھا۔دو بہنیں بھی تھیں۔ میرے والد اپنے ماں باپ کی اولاد میں سے سب سے چھوٹے تھے۔ ابھی آپ عمر کے ابتدائی سالوں میں تھے کہ ماں اور باپ دونوں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کا ایک چچا تھا ‘اس کے زیر کفالت آ گئے۔ چچا بڑا سخت گیر تھا۔ والد صاحب انہیں دعائیں دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کی سختی نے میرے جسم سے سستی اور کاہلی نکال دی۔ جب وہ صبح جگانے کے لئے آواز دیتے تو پہلی آواز پر ہی نہایت چستی کے ساتھ انہیں جواب دینا ہوتا تھا۔ عسرت اورناداری کا دور تھا۔چچا کی اپنی اولاد بھی تھی۔ حالات کی مجبوری کے تحت کسی کو بھی سکول نہ بھیج سکے‘ ہر ایک کو چھوٹے موٹے کام پر لگا دیا۔یوں میرے والد صاحب بھی ناخواندہ رہ گئے۔ بعد ازاں جب جوان ہوئے تو پڑھنے لکھنے کا شوق ہوا۔ ابتدائی قاعدہ لیا اور جاننے والے دوست احباب سے سبق لے لیا کرتے۔ چنانچہ انہوں نے معمولی لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ پڑھ تو خوب لیتے تھے مگر لکھنا صرف کام چلانے کی حد تک جانتے تھے۔ جب ہم نے بڑے ہو کر انہیں لکھتے دیکھا تو ہم ہنستے تھے نصیر کو ’’نسیر‘‘ اور قیصر کو ’’کیسر‘‘ لکھتے تھے۔ ہمیں ہنستا دیکھ کر کہتے کہ میں نے کون سا سکول میں پڑھا ہے‘ میں تو بس اپنا کام چلا لیتا ہوں۔

میرے والد اور تایا کا اتفاق مثالی تھا۔ دونوں ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ دونوں صاحب اولاد ہوئے۔بیٹیاں بڑی ہو گئیں۔ ان میں سے بعض کی شادیاں

بھی ہو گئیں۔ مگر دونوں ایک ہی جگہ رہتے اور کھاتے پیتے تھے۔ والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ ہم دونوں بھائیوں کی بیٹیاں ہی تھیں۔ عزیزوں رشتہ داروں نے ہمیں مجبور کیا کہ دونوں بھائی الگ الگ رہائش کر لو' کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اولادِ نرینہ سے نوازے۔ چنانچہ دونوں بھائی بادلِ نخواستہ الگ ہوئے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے دونوں کو اولادِ نرینہ سے نوازا۔ لڑکیوں کے بعد میرے تایا کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا اور پھر تایا جان اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میرے والد کے ہاں چار بیٹے ہوئے جن میں مَیں سب سے بڑا ہوں۔ بھائی کی وفات کے بعد میرے والد صاحب نے اپنی بیوہ بھابی اور اکلوتے بھتیجے کو زیر کفالت لینا چاہا مگر انہوں نے قبول نہ کیا۔ میرے تایا زاد کو تعلیم سے دلچسپی نہ تھی لہٰذا وہ معمولی تعلیم کے بعد کاروبار میں لگ گیا۔

میرے والد صاحب کو تعلیم کا بہت شوق تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میرے بچے اعلیٰ تعلیم پا کر سرکاری ملازمت میں آئیں' مگر وسائل کی کمی آڑے آرہی تھی۔ ہم دونوں بھائیوں نے یکے بعد دیگرے گائوں سے مڈل کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ گائوں میں اُس وقت ہائی سکول نہ تھا [اب ڈگری کالج موجود ہے] میٹرک کرنے کے بعد شیخوپورہ آنا پڑا۔ چنانچہ ہم دونوں بھائیوں نے اوّل درجے میں میٹرک پاس کر لیا۔ ہم آگے پڑھنا چاہتے تھے مگر والد صاحب ہماری مزید تعلیم کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے تھے اور قرض لینے سے وہ انتہائی گریزاں تھے' لہٰذا ہمیں تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا۔ مجھے تو انہوں نے گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ میں ایس دی ٹیچر کی تربیت کے لئے داخل کروا دیا جبکہ چھوٹا بھائی اے جی آفس میں جونیئر کلرک لگ گیا۔ میری تربیت مکمل ہوئی تو مجھے گورنمنٹ ہائی سکول ننکانہ صاحب میں ملازمت مل گئی۔ ۴ نومبر ۱۹۶۰ء سے میری ملازمت شروع ہو گئی' جبکہ میری شادی اس سے چند ماہ پہلے ۲۰ سال کی عمر میں ہی ہو چکی تھی۔ میں نے ایف اے کی تیاری شروع کر دی۔ میری بیوی اور بعد ازاں میرے بچوں کی نگہداشت اور پرورش کا ذمہ میرے والد صاحب نے اٹھایا اور مجھے اس بوجھ سے آزاد کر دیا تاکہ میں سکون کے ساتھ حصولِ تعلیم میں لگ سکوں۔ چنانچہ اگلے سال ۱۹۶۱ء

میں مَیں نے پرائیویٹ طور پر بغیر کوئی اکیڈمی جائن کئے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کر لیا۔ [اُس وقت اکیڈمیوں کا رواج ہی نہ تھا' اپنے اساتذہ سے پرائیویٹ ٹیوشن البتہ تھی مگر وہ بھی خال خال] بی اے کی تیاری شروع کی تو انگلش خاصی مشکل تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ ننکانہ میں رہ کر بی اے نہیں ہو سکے گا چنانچہ لاہور تبادلے کی کوشش کی۔ لاہور تبادلہ بہت ہی مشکل تھا مگر والدین کی دعائیں اور تمنائیں رنگ لائیں کہ میرا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول باغبان پورہ میں ہو گیا۔ چھوٹا بھائی پہلے ہی لاہور میں تھا۔ ہم دونوں بھائیوں نے باغبان پورہ میں اکٹھی رہائش رکھ لی اور بی۔ اے کی تیاری شروع کر دی۔ اس کے لیے ہم ہر روز شام کے اوقات میں سائیکل پر لکشمی چوک آیا کرتے تھے۔ جہاں پروفیسر نیاز محمد بی۔ اے کی کلاس لیتے تھے وہ بڑے لائق' محنتی اور ماہر استاد تھے۔ دور دور سے طالب علم ان سے

پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ اللہ کی مہربانی سے پہلے میں نے اور بعد ازاں میرے بھائی نے بھی بی۔اے کا امتحان پاس کر لیا ۔ اس سارے عرصے میں میرے بیوی بچے اور بعد ازاں میرے چھوٹے بھائی کے بیوی بچے بھی ہمارے والدین کے پاس گائوں میں رہے' وہی ان کی پرورش اور نگہداشت کرتے رہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ہمیں اپنے بیوی بچوں کو لاہور ساتھ رکھنا پڑتا اور ہم پرائیویٹ تعلیم کے لئے وقت نہ نکال سکتے اور اعلیٰ تعلیم سے محروم رہتے۔ لاہور میں رہ کر میں نے بی اے کے بعد سی ٹی' پھر بی۔ ایڈ کے امتحان پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے پاس کر لئے اور پھر پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم و تحقیق میں داخلہ لے کر ایم ایڈ بھی کر لیا۔ اس دوران چھوٹے بھائی کو وفاقی سیکرٹیریٹ اسلام آباد میں نوکری مل گئی۔ وہاں اس نے ایم اے انگلش کی پرائیویٹ تیاری شروع کر دی اور گارڈن کالج راولپنڈی کے شعبہ انگریزی کے مشہور ٹیچر پروفیسر مل کی اکیڈمی میں داخلہ لے لیا اور اللہ کی مہربانی سے ایم اے انگلش میں کامیابی حاصل کی۔ بعد ازاں پبلک سروس کمیشن پنجاب میں سیکشن آفیسر کا امتحان دیا اور کامیاب ہو کر صوبائی سیکرٹیریٹ لاہور میں سیکشن آفیسر کی پوسٹ پر تعینات ہوئے۔ ترقی کرتے کرتے سیکرٹری حکومت پنجاب کے منصب تک پہنچے۔

15

جب میں نے ایم ایڈ کر لیا تو مجھے سینئر ٹیچر کے طور پر لاہور سے باہر سرسبز و شاداب دیہاتی علاقے میں بھیج دیا گیا' جہاں چند ماہ گزارنے کے بعد میرا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ میں ہو گیا جہاں سے میں نے میٹرک کیا تھا اور میرے اساتذہ بھی اسی سکول میں پڑھا رہے تھے۔ اب میں ان کا colleague بن گیا۔ یہ سارا کچھ اس لئے ہوا کہ والدین کی دعائیں شامل حال رہیں اور انہوں نے میری بیوی بچوں کا ہر طرح کا بوجھ اٹھائے رکھا اور مجھے اطمینان اور سکون فراہم کیا جس کی وجہ سے میں دلجمعی کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے میں لگا رہا۔

تقسیم ہند کے وقت میرے والد صاحب صوبہ بہار میں رانچی کے مقام پر تھے' وہاں وہ آرمی کو یونیفارم مہیا کرتے تھے۔ وہ علاقہ بھارت کے حصہ میں آیا تو وہاں سے پاکستان آنا تھا۔ کچھ لوگ تو پہلے ہی وہاں سے نقل مکانی کر آئے مگر میرے والد صاحب وہیں رہے اور جب آرمی کے وہاں سے شفٹ ہونے کا وقت آیا تو ان کے ساتھ ہی بذریعہ ٹرین وہ بھی لاہور پہنچے اور وہاں سے گوجرانوالہ ہوتے ہوئے اپنے گائوں جنڈیالہ شیر خان پہنچ گئے۔ اس سفر کے دلدوز حالات وہ بعد ازاں سنایا کرتے تھے اور اسے اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد سمجھتے تھے کہ وہ جان سلامت لے کر بہار سے پنجاب میں اپنے گھر پہنچ گئے۔ جبکہ راستے میں ٹرین پر کئی خونی حملے ہوئے اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ ٹرین خون آلود تھی۔ راستے میں جگہ جگہ لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ٹرین آہستہ رفتار سے چلتی تھی اور سفر میں کئی دن لگ گئے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ جو کچھ وہاں سے کما کر لائے تھے اس کا ایک حصہ غرباء اور مساکین میں تقسیم کر دیا ۔ اس تقسیم کا انداز بھی نرالا تھا۔ ایک دن گلیوں میں پھر کر سروے کیا۔ بیوائوں

اور ناداروں کے گھر معلوم کئے۔ اگلی رات تاریکی میں گھر سے نکلے۔ باری باری امداد کے مستحق کا دروازہ کھٹکھٹاتے اور اُس کے ہاتھ میں رقم رکھ دیتے اور چل دیتے۔ نہ اپنا تعارف کراتے اور نہ ہی نام بتاتے۔ تقسیم کے بعد جو رقم بچی اس کے ساتھ گائوں میں ایک دکان کھول کر بیٹھ گئے۔ دکان میں روزمرہ کی اشیاء اور کپڑا بھی تھا۔ دکان کا مال کچھ شیخوپورہ

16

سے خرید کر لے جاتے اور کچھ دوسرا سامان کپڑا وغیرہ خریدنے کے لئے لاہور آتے۔ اس وقت گائوں سے شیخوپورہ تک پختہ سڑک نہ تھی۔ تانگے چلتے تھے یا پھر سائیکل پر سفر ہوتا تھا۔ شیخوپورہ سے لاہور تک سڑک پختہ تھی لیکن کشادہ نہ تھی۔ بارش کے دنوں میں یہ سڑک بند بھی ہو جایا کرتی تھی۔

میرے والد صاحب کا دکان چلانے کا انداز بھی نرالا تھا۔ گائوں کا ماحول تھا۔ لوگ غریب تھے۔ مہاجرین تھے تو وہ لٹ پٹ کر آئے تھے۔ میرے والد صاحب کو لوگوں کی کمزوری کا گہرا احساس تھا' چنانچہ وہ معمولی سے معمولی گاہک کو بھی واپس نہ لوٹاتے۔ ایک بابا مہاجر تیل لینے کے لئے دکان پر آیا' ہاتھ سے بوتل گر کر ٹوٹ گئی 'اس نقصان پر وہ آنسو بہانے لگا ۔آپ نے اسے اپنے پاس سے بوتل دی اور اُس میں تیل بھی ڈال دیا۔ اس کی حالت زار دیکھ کر اس کی مالی امداد بھی کر دی۔ ہم نے وہ بابا دیکھا 'جب تک زندہ رہا دعائیں دیتا رہا اور ممنون رہا۔

کوئی شخص دکان پر آتا اپنی ناداری کا اظہار کرتا اور ادھار مانگتا تو بلاضمانت اسے ادھار دے دیتے۔ اس طرح ان کی ارد گرد کے دیہاتوں میں بھی شہرت ہو گئی۔ چنانچہ ضرورت مند دور دور سے چل کر ادھار خریداری کے لئے آتے۔ والد صاحب کاپی میں ان کا نام' خریدی ہوئی چیز اور رقم درج کر لیتے۔ اُس وقت رواج تھا کہ دیہاتی دکاندار ادھار دیتے تھے' پھر فصل پکنے کے موقع پر وہ لوگوں سے قرض کی رقم وصول کرنے کے لئے ان کے گھروں میں پہنچ جاتے تھے۔ مگر میرے والد صاحب کبھی کسی کے ہاں وصولی کے لئے نہ جاتے بلکہ لوگ خود ہی آکر دیتے تو لے لیتے۔ اس طرح کئی لوگوں سے ادھار کی رقم واپس نہ ملتی۔ ہم بھائی اور والدہ ان کو کہتے کہ اگر آپ ادھار واپس نہیں لے سکتے تو دیتے ہی کیوں ہیں؟ دیکھیں آپ کی کاپیاں ادھار کے ناموں سے بھری پڑی ہیں۔ یہ ادھار کب وصول ہوگا؟ وہ کہتے جب کوئی ضرورت مند آکر اپنی غربت کا اظہار کرتا ہے تو میں اُسے انکار نہیں کر سکتا' اللہ تعالیٰ مجھے روزی دے رہا ہے۔ ایک دن ہم نے ذرا زوردار انداز میں اُن کے اس طرح لوگوں کو ادھار سودا دینے پر اعتراض کیا تو

17

جلال میں آگئے' ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ تمہارے خیال میں میں اپنا نقصان کرتا ہوں' ٹھیک ہے اپنا ہی نقصان کرتا ہوں 'تم میں سے کسی کی کمائی تو ضائع نہیں کرتا' پس تمہیں اس معاملے میں مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں' آئندہ

میں ایسی بات سننے کو تیار نہیں۔ اس کے بعد ہم نے انہیں منع نہیں کیا۔ یوں ضرورت مندوں کی مدد کرنا گویا ان کا مشن تھا۔ جب آپ کی رحلت ہوئی تو ادھار والی کاپیاں ہمارے ہاتھ لگیں' ان میں لوگوں کے نام اور ادھار کی رقم لکھی ہوئی تھی۔ ہم نے چاہا کہ ان لوگوں سے رابطہ کر کے ان سے رقم کا تقاضا کریں۔ اس سلسلہ میں ابتدا کی اور ایک شخص کو کہا کہ کاپی میں تمہارے نام اتنی رقم لکھی ہوئی ہے 'اس کی ادائیگی کر دیجئے ۔اس نے جواب دیا کہ میں نے تو رقم ادا کر دی تھی 'وہ میرے نام کے آگے درج رقم کاٹنا بھول گئے ہیں۔ اس پر ہمیں شرمندگی سی ہوئی۔ رات کو والد صاحب مجھے خواب میں ملے۔ خوبصورت سفید لباس پہنے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ میں نے ملاقات کو غنیمت جانتے ہوئے پوچھ لیا کہ ابا جان ! ہم نے فلاں شخص سے ادھار کی رقم واپس مانگی جو آپ کی کاپی میں لکھی ہوئی تھی مگر اس نے کہا کہ میں نے تو واپس کر دی ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ اس پر والد صاحب نے جواب دیا تمہیں کس نے کہا تھا کہ قرض کی رقم کا تقاضا کرو؟ یہ میرا معاملہ ہے۔ جو تمہیں خود گھر آ کر قرض کی رقم دے دے اس سے لے لو' مگر کسی سے تقاضا نہ کرو۔ میں جانوں میرا کام ! چنانچہ اس کے بعد ہم نے کسی سے رقم نہیں مانگی۔ اگر کوئی خود آ کر دے جاتا تو لے لیتے۔

آپ پنج گانہ نماز باقاعدگی سے ادا کرتے۔ نماز کے وقت دکان بند کر دیتے۔ اگر مؤذن یا امام وقت کی پابندی میں کوتاہی کرتے تو ناراض ہوتے اور کہتے کہ جب وقت مقرر ہے تو اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے تاکہ بلاوجہ نمازیوں کو دقّت نہ ہو۔ اسی طرح اگر کسی بڑے آدمی کے انتظار میں ایک دو منٹ تاخیر کی جاتی تو وہ ٹوک دیتے کہ مسجد میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں' بلکہ ''تیرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے''۔

ایک دفعہ مسجد میں اعلان ہوا کہ میت کو قبرستان میں لے جانے کے لئے چارپائی کی

ضرورت ہے۔ دو تین دفعہ کے اعلان پر کسی نے حامی نہ بھری تو انہوں نے ہاں کر دی۔ چارپائی کا آرڈر دے دیا۔ بنانے والے نے عمدہ قسم کی چارپائی تیار کر دی جس کی قیمت والد صاحب کی استطاعت سے زیادہ تھی ۔تاہم انہوں نے بلاحیل و حجت قیمت ادا کر دی۔ اس کے تھوڑا عرصہ بعد اُن کے انتقال ہو گیا اور اُسی چارپائی پر انہیں قبرستان لے جایا گیا۔ گاؤں میں کسی غریب اور نادار کے کفن کے لئے کپڑا درکار ہوتا تو دے دیتے' رقم کا تقاضا نہ کرتے۔ کوئی دے دیتا تو لے لیتے۔

میرے والد اگرچہ ناخواندہ تھے مگر سلیم الفطرت تھے ۔ اچھائی' برائی' صحیح اور غلط میں تمیز کر لیتے تھے۔ دیہاتی ماحول میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے پرورش پائی تھی۔ گاؤں کے جاہلانہ رسم و رواج ان کے سامنے تھے مگر انہوں نے کبھی فضول رسموں کو قبول نہ کیا۔ میں جب بڑا ہوا' دین کا مطالعہ کیا تو جب بھی انہیں قرآن و حدیث کی بات بتائی اس کو انہوں نے اس طرح قبول کیا گویا ان کے دل کی بات ہو۔ غیر اللہ سے مدد مانگنا ان کے نزدیک

انتہائی قابل نفرت بات تھی۔ وہ کہتے تھے مخلوق کا ہر فرد اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے' لہٰذا اُسی کی طرف سب کو رجوع کرنا چاہیئے ۔ اس کے خزانے غیر محدود ہیں 'اُس سے مانگنے میں کوئی عار نہیں۔ خاص طور پر اولاد کی خواہش میں مقبروں پر چڑھاوے چڑھانے کو حماقت اور نادانی جانتے ۔ اس سلسلہ میں وہ ایک ہندو کا شعر پڑھا کرتے ے

دادوَ دنیا باوری مڑھیاں پوجن اُوت
جو دنیا تھیں لد گئے اُن تھیں مانگیں پوت !

[دادوَ شاعر کا نام ہے۔ دیکھو دنیا والے کتنے پاگل اور بیوقوف ہیں کہ قبروں کی پوجا کرتے ہیں اور فوت شدہ لوگوں سے بیٹے مانگتے ہیں۔]

ہم بھائی تعلیم میں اچھے تھے۔ مقامی سکول میں پڑھتے تو کلاس میں اوّل دوم رہتے۔ گاؤں میں لوگ ہماری تعریف کرتے اور ہمارے والد صاحب سے پوچھتے کہ آپ کے بچے پڑھائی میں اتنے لائق کیوں ہیں۔ وہ جواب دیتے کہ میں تو خود اَن پڑھ ہوں' پڑھائی کے سلسلہ میں میں ان کی کوئی راہنمائی نہیں کر سکتا 'نہ ہی کسی اور ذریعے سے انہیں کوئی مدد مل سکتی ہے 'بس میں تو یہ جانتا ہوں کہ انہیں میں نے رزق حلال کھلایا ہے اور

ہمیشہ اس بات کی تلقین کی ہے کہ محنت کرواور اپنا راستہ خود بنائو۔ نہ میرے پاس کوئی سفارش ہے اور نہ ہی میں سفارش کو اچھا سمجھتا ہوں۔ میں انہیں کہتا ہوں آنکھیں کھول کر دیکھو گے تو تمہیں چپڑاسی بھی نظر آئیں گے اور آفیسر بھی۔ تم جو بننا چاہو بن جائو۔ جتنی محنت کرو گے اتنا پھل پائو گے۔

میرے والد صاحب کو ملازمت بہت پسند تھی ۔ وہ کہتے تھے کہ ملازم کی آمدنی مقرر ہوتی ہے ۔اگر وہ ذرا بھی سمجھ دار ہوتا تو اسے اپنا ماہانہ بجٹ بنانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی وہ اپنی آمدنی کے مطابق اخراجات کر کے ہر ماہ کچھ رقم بچا بھی سکتا ہے پھر ملازم کی آمدنی میں ناغہ نہیں ہوتا اگر وہ بیمار ہو جائے یا کسی کام کی وجہ سے دفتر نہ جا سکے تو وہ چھٹی پر ہوتا ہے اور اسے تنخواہ تو ملتی ہے ۔ اس کے برعکس دکاندار اگر کسی ناگزیر وجہ سے دکان نہ کھول سکے تو اس کو اس دن کی کوئی آمدنی نہ ہوگی وہ قرآن مجید نہیں پڑھ سکتے تھے' چنانچہ عمر کے آخری سالوں میں مجھ سے سبقاً سبقاً قرآن مجید پڑھا۔ پورا قرآن پڑھ لیا تو بہت خوش ہوئے اور لوگوں میں شیرینی تقسیم کی۔ میرے والد صاحب سلیم الفطرت تھے۔ گناہ اور برائی کے کاموں سے انہیں نفرت تھی۔ کسی کو بھی بری عادت میں گرفتار دیکھتے تو بڑے حکیمانہ انداز میں اُسے نصیحت کرتے اور سیدھی راہ اختیار کرنے کی ہدایت کرتے۔ محنت کو کامیابی کی کلید جانتے تھے۔ ان کے وجود میں سہل انگاری کا نام و نشان نہ

تھا۔ اپنا کام خود کرتے ‘دوسروں کو کام کہنے سے گریز کرتے۔ سست اور کاہل بندے کو ناپسند کرتے۔ وہ کہتے کہ ہر کام کو محنت اور لگن کے ساتھ خوبصورت انداز میں کرنا چاہیئے۔ اگر کوئی جھاڑو بھی دے تو دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اچھا دے۔ کوشش کرنا چاہیئے کہ اپنے ساتھیوں میں امتیازی پوزیشن حاصل ہو۔ ان کا اپنا حال یہ تھا کہ جہاں جہاں انہوں نے کام کیا وہاں اپنے ساتھیوں سے آگے آگے رہے۔

خدا ترسی کا مظہر تھے۔ کوئی ایک غریب آدمی ہمیشہ ان کا دوست ہوتا جس کی مشکل میں مدد کرتے تھے۔ ان کے ایک دوست کی بیٹی کی شادی تھی۔ وہ تنگ دست تھا۔ ہماری

والدہ کے زیورات میں سے کچھ اس کو دے دیئے‘ پھر زندگی بھر واپس نہیں لئے۔ ہم کہتے کہ واپس مانگیں۔ وہ جواب دیتے کہ جب اس کے پاس ہوں گے خود ہی دے دے گا‘ کسی تنگدست کو پریشان کرنا گناہ کی بات ہے۔

ایک غریب کسان ان کا دوست تھا۔ اس کا بیٹا میرا ہم جماعت تھا۔ دوسری یا تیسری جماعت کی بات ہے میں پڑھائی میں اچھا تھا مگر وہ لڑکا انتہائی کند ذہن تھا۔ میرے والد مجھے کہتے کہ اس لڑکے کو ساتھ لے کر چلو ‘اسے پڑھایا کرو۔ جب میں اس کو سبق یاد کروانے میںناکام رہتا تو مجھ سے ناراض ہوتے اور سخت سست کہتے ۔ ایک دفعہ تو اس کوتاہی پر مجھے تھپڑ بھی رسید کئے۔

میرے والد صاحب بڑے دانا تھے۔ ہمدردی اور غمگساری ان کی طبیعت کا جزو تھی۔ جس کو پریشان دیکھتے اسے صحیح مشورہ دیتے۔ کام چوروں سے انہیں سخت نفرت تھی۔ ایک دفعہ ایک جوان بے روزگار تھا۔ ان کے پاس اٹھتا بیٹھتا تھا۔ ایک دن کہنے لگا مجھے نوکری مل گئی ہے۔ وہ سن کر بہت خوش ہوئے ۔کہنے لگے جائو اور ڈٹ کر محنت کرو۔ چند دنوں کے بعد اُس سے ملاقات ہوئی تو پوچھا سنائو نوکری کیسی چل رہی ہے؟ وہ کہنے لگا میںنے وہ نوکری چھوڑ دی ہے۔ کہنے لگے کیوں؟ اس نے کہا نوکری بہت سخت تھی‘ گرم بھٹی کے آگے کھڑے ہو کر کام کرنا پڑتا تھا۔ کہنے لگے تم سے پہلے بھی وہاں کوئی کام کرتا تھا؟ کہنے لگا ہاں۔ پھر پوچھا تم چھوڑ آئے ہو تو اب بھی وہاں کوئی کام کرے گا یا نہیں؟ کہنے لگا کرے گا۔ پھر کہا افسوس تم پر کہ وہ کام تمہارے لئے مشکل ہے جو دوسرے بخوبی کر رہے ہیں۔ کوئی کام مشکل نہیں‘ انسان کا ارادہ مضبوط اور ہمت جواں ہونی چاہیئے۔

میرے اباجان حد درجہ متوکل تھے ۔اگرچہ وہ ناخواندہ تھے مگر سلیم الفطرت ہونے کے باعث وہ توکل کا مطلب خوب سمجھتے تھے ان کا کہنا تھا کہ انسان کو مسائل کے حل کے لیے شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے بھرپور محنت اور جدوجہد کرنی چاہیے اور وقت کی قدر و قیمت پہچانتے ہوئے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اپنی استطاعت کے

مطابق محنت اور خلوص سے کام کرنے کے بعد نتیجہ اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔

وہ کردار و عمل میں بڑے راست رو تھے۔ فضولیات سے نفرت تھی۔ اخلاقی کمزوریوں سے نفور تھے۔ ایک دفعہ دکان میں بیٹھے تھے کہ سامنے سے ایک قلفی بیچنے والا گزرا جو آواز لگا رہا تھا ''کھوئے ملائی والی قلفی''۔ آپ نے اسے پاس بلایا اور بڑے پیار سے پوچھا ''سچی بات بتائو تم نے اس قلفی میں کھویا ڈالا ہے؟'' اس نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا ملائی ڈالی ہے؟ کہنے لگا نہیں۔ اس پر انہوںنے کہا سارا دن جھوٹ بول رہے ہو جو بڑے گناہ کی بات ہے۔ اس طرح آواز لگائو کہ ''ٹھنڈی اور میٹھی قلفی''اس نے یہ نصیحت قبول کی۔ اس طرح ایک بے خبر کو سیدھی راہ پر ڈال دیا۔

گائوں کے خوشحال خاندان کا ایک فرد تھا۔ شریف آدمی تھا'پنج گانہ نماز ادا کرنے والا تھا۔ اُسے عادت تھی کہ جو خوانچہ فروش یا ریڑھی والا پاس سے آواز لگاتا ہوا گزرتا اُس سے چیز کا بھائو پوچھتا اور بیریا کھجور وغیرہ کی قسم کا پھل ہوتا تو ایک دو دانے اٹھا کر کھا لیتا۔ میرے والد صاحب کو یہ انداز بہت ناپسند تھا۔ ایک دن اس کو کہنے لگے کہ بھائی آپ یہ کیا کرتے ہیں کہ غریب آدمی کی ریڑھی سے بلااجازت اور بلاقیمت چیز اٹھا کر کھا لیتے ہیں' خریدتے نہیں۔اس طرح آپ خواہ مخواہ اس کا نقصان کرتے ہیں۔ یہ عادت ٹھیک نہیں ۔ ہمیشہ خرید کر چیز کھانی چاہیے اس طرح اُس آدمی سے ایک بری عادت چھڑوا دی۔

کسی کے تکلیف کا سبب بننا ان کو سخت نا پسند تھا ان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ دوسروں کا چھوٹا موٹا کام جو اپنے اختیار میں ہو کر دیں مگر کسی پر کوئی بوجھ نہ ڈالیں اور نہ ہی اس کا دل رنجیدہ کریں ۔ایک دن اپنی بہو (میری بیوی) پوچھنے لگے کہ تمہیں گھر میں رویے سے کوئی شکایت تو نہیں ؟ وہ کہنے لگی کہ ہر گز نہیں ۔اس پر کہنے لگے کہ شائد تم احترام اور مروت کی وجہ سے ایسا کہہ رہی ہو !مگر سنو اگر میرے رویے میں تمہیں کوئی بات نہ پسند ہو اسے یاد رکھو اور جب تمہاری بہو آئے اس کے ساتھ وہ رویہ اختیار نہ کرنا۔

22

میرے والد صاحب حقّہ بہت پیتے تھے ۔ان کے ہاں اچھے سے اچھا تمباکو مل جاتا تھا۔ چوبیس گھنٹے ان کا حقّہ تیار ہوتا تھا۔ مگر ہمیں وہ سگریٹ اور حقہ نہ پینے کی ہدایت کرتے تھے۔ ہم نے پوچھا کہ آپ ہمیں تو منع کرتے ہیں مگر خود اتنا زیادہ حقّہ پیتے ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ میرے ماں باپ بچپن میں فوت ہو گئے تھے' مجھے ماں باپ کی شفقت نصیب نہ ہوئی' میری پرورش مناسب نگرانی میں نہ ہوئی' دیہاتی ماحول تھا' حقّہ پینا عام تھا' لہٰذا مجھے بھی اس کی عادت پڑ گئی' اب اس کی برائی کا گہرا احساس ہے مگر اب یہ عادت پختہ ہو گئی ہے ' چھوٹتی نہیں۔ پھر ہمیں کہا کہ تمہارا معاملہ بالکل مختلف ہے' تمہاری پرورش ماں باپ کے زیر سایہ ہورہی ہے' ہم تمہیں اچھی باتوں کے اختیار کرنے اور بری باتوں سے رکنے کی نصیحت کرتے ہیں اور نگرانی بھی کرتے ہیں 'اگر اس کے باوجود تم تمباکو نوشی کرنے

لگو تو پھر میرے اور تمہارے درمیان کیا فرق رہ گیا؟ تمہیں میں اس سے منع کرتا ہو پھر کتابوں میں تم تمباکو نوشی کے نقصانات پڑھتے ہو۔ اس سب کچھ کا تقاضا یہ ہے کہ تم ہرگز اس بری عادت کے قریب نہ جاؤ۔ چنانچہ ہم بھائیوں اور بھائیوں کے بچوں میں سے کوئی بھی سگریٹ نہیں پیتا بلکہ ہم سب سگریٹ سے نفرت کرتے ہیں۔ حقّہ ہمارے گھروں میں نہیں ہے۔ اگر کوئی مہمان سگریٹ کا عادی ہمارے ہاں آجائے تو ہمارے رویئے سے وہ خود اندازہ لگا لیتا ہے کہ یہ لوگ سگریٹ پینے کو پسند نہیں کرتے۔ میرے والد صاحب ہمہ وقت حقّہ پیتے تھے مگر انہوں نے نہ تو کبھی گھر کے کسی فرد کو حقّہ تازہ کرنے کے لئے کہا اور نہ ہی حقّے کے لئے کوئلے سلگانے کو کہا۔ دن اور رات کے اوقات میں وہ خود ہی یہ سارے کام کرتے۔

میرے والد رقیق القلب تھے۔ کسی کو دکھ اور تکلیف میں دیکھ کر پریشان ہوجاتے اور جہاں تک ہوسکتا اُس کے لئے آسانی پیدا کرنے کی کوششیں کرتے۔ میرے ایک ہی ماموں تھے' ان کے ساتھ حقیقی بھائیوں جیسا سلوک کرتے ۔ ایک دفعہ ماموں جان ایک سفر سے پریشان واپس آئے۔ معلوم ہوا کہ دورانِ سفر کسی نے ان کی جیب کاٹ لی ہے اور تمام رقم اڑا لی ہے ۔ والد صاحب نے ماموں جان کو بلایا اور ان سے صورت حال دریافت کی۔ ان کو پریشان دیکھا تو مجھے کہا کہ اندر سے میرا بٹوہ لاؤ۔ میں بٹوا لایا تو

نقصان کی پوری رقم جو غالباً پانچ سو تھی ان کے حوالے کی۔ انہوں نے لینے سے انکار کیا تو کہنے لگے کہ بھائی کا فرض ہے کہ وہ بھائی کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ انہیں رقم لینے پر آمادہ کر لیا۔

میرے ماموں جان کے ہاں اولاد نہ تھی۔ دوسرا نکاح بھی کیا مگر آرزو پوری نہ ہوئی۔ احساسِ محرومی انہیں ہمہ وقت آزردہ خاطر رکھتا۔ والد صاحب نے میری والدہ سے مشورہ کیا اور فیصلہ کیا کہ اپنا نومولود بیٹا ان کو دے دیں۔ اس فیصلے کا ماموں اور ممانی کو علم ہوا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ شیر خوار بچہ اپنے گھر لے گئے۔ انتہائی شفقت اور محبت سے اس کی پرورش شروع کر دی۔ ادھر ہماری والدہ کا نومولود بچے کی جدائی میں برا حال تھا۔ اگرچہ انہوںنے بچہ برضا ورغبت دیا تھا لیکن ماں کی ممتا تو فطرت کا تقاضا ہے۔ از خود گود کو بچے سے خالی کر لینا انتہائی کرب کا باعث تھا۔ اس صورت حال میں والد صاحب انتہائی مضبوط رہے اور والدہ کو تسلی دیتے رہے اور کہتے کہ اس بات کا احساس کرو کہ ہمارے اس اقدام نے تمہارے بھائی اور بھابی کے مرجھائے ہوئے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑا دی ہے۔ کیا ان کو خوشی فراہم کرنا اور ان کا احساس محرومی ختم کرنا ہمارے لئے اطمینان کا باعث نہیں ہے؟ اس سب کچھ کے باوجود تصویر کا دوسرا رخ بھی ان کے سامنے تھا۔ ایک دفعہ کہنے لگے کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ مجھے کہے کہ جب میں نے انہیں اولاد نہ دی تو تم کون ہوتے ہو اولاد دینے والے؟ اس خیال سے ان پر خوفِ خدا کا غلبہ ہوا' رقت طاری ہوئی۔ یہ دیکھ کر میں نے انہیں تسلی دی کہ آپ نے بیٹا اس لئے تو نہیں دیا کہ اللہ

نے نہیں دیا تو میں دیتا ہوں۔ آپ نے تو ایک بھائی کی آزردگی دور کرنے کے لئے بہت بڑی قربانی دی ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہے کہ ایک بھوک سے نڈھال شخص کو کوئی اپنے کھانے میں شریک کر کے اس کی بھوک مٹا دے اگرچہ خود اس کی اشتہا باقی ہو۔ اس پر وہ قدرے مطمئن ہو گئے۔

میرے والد صاحب سادگی پسند تھے۔ سادہ لباس پہنتے۔ سادہ خوراک انہیں پسند تھی۔ اپنے بیٹے بیٹیوں کی شادیاں انتہائی سادہ انداز میں منعقد کیں۔ ان کو اس بات

میرے والد صاحب سادگی پسند تھے۔ سادہ لباس پہنتے۔ سادہ خوراک انہیں پسند تھی۔ اپنے بیٹے بیٹیوں کی شادیاں انتہائی سادہ انداز میں منعقد کیں۔ ان کو اس بات سے ذرا عار نہ تھی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ ان کا مقولہ تھا کہ ہمیشہ اپنی چادر کے مطابق پائوں پھیلائو۔ ان کا اندازِ زیست "مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ " [جس نے میانہ روی اختیار کی وہ محتاج نہ ہوا] کا مصداق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مالدار نہ تھے مگر لوگ انہیں مالدار سمجھتے تھے۔

عزیز و اقارب اور برادری میں کوئی شخص فوت ہو جاتا تو جنازے میں شرکت کرتے۔ اگر گائوں سے باہر کہیں ایسا واقعہ پیش آتا تو بس تعزیت کے لئے ایک ہی دفعہ جاتے۔ بار بار کے جانے کو پسند نہ کرتے 'بلکہ لوگوں کو بھی تلقین کرتے کہ وہ رسم و رواج کی خاطر فوتگی والے گھر بار بار نہ جائیں۔نہ خود تکلیف میں پڑیں اور نہ میت کے ورثاء کو مشکل میں ڈالیں۔

میرے والد صاحب مشقت کے عادی اور عزم و ہمت کا پیکر تھے ۔زندگی میں ایک دَور ایسا بھی آیا کہ انہیں شیخوپورہ شہر میں دکان کرنا پڑی ۔ شیخوپورہ سے گائوں جنڈیالہ شیر خان کا فاصلہ ۹ میل(چودہ کلومیٹر) ہے۔ اُس وقت کچی سڑک تھی جس پر تانگے چلتے تھے۔ تانگے سے یہ فاصلہ دو گھنٹے میں طے ہوتا تھا [اب یہ سڑک پختہ ہو چکی ہے] والد صاحب کئی سال یہ دکان چلاتے رہے اور روزانہ کا معمول یہ تھا کہ صبح فجر کی نماز پڑھ کر پیدل چل پڑتے۔ شہر پہنچ کر دکان کھولتے۔ سارا دن کام کرتے۔ مغرب کی نماز شہر میں پڑھ کر واپس پیدل چل پڑتے۔ گائوں پہنچ کر عشاء کی نماز پڑھتے۔ رات آرام کرتے اور صبح پھر بعد از نماز فجر شہر کے لئے چل پڑتے۔ اُن کا یہ معمول کئی سال تک رہا۔ پیدل چلنا صحت کے لئے بہت مفید بتاتے ہیں۔ میرے والد صاحب کی صحت اچھی رہی۔ جسم دبلا پتلا تھا۔ دانت اخیر تک صحیح سالم رہے۔ بڑھاپے میں بھی نوجوانوں کی طرح دانتوں سے گنا چھیلتے اور چوستے تھے۔ آخری عمر میں البتہ کھانسی شدت اختیار کر گئی۔ اس کھانسی نے ان کو بے بس کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے اس کھانسی کی وجہ وہی حقہ نوشی تھی جس نے ان کے پھیپھڑوں کو شدید متاثر کر دیا تھا۔ اسی بیماری میں وہ ۷۲ سال کی عمر میں ۱۹۷۴ء میں

اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ہم نے اُن کی جوانمردی، سخت کوشی اور مضبوط عزم و استقلال سے بہت کچھ سیکھا۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ

اِسلام دینِ فطرت

اللہ تعالیٰ خالق کائنات ہے، وہ ہر مخلوق کی حدود اور صلاحیتوں کو خوب جانتا ہے۔ وہ الحکیم ہے اور اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ انسان اس کی شاہکار تخلیق ہے۔ یہ اشرف المخلوق ہے۔ اس کی تخلیق بھی بامقصد ہے۔ سورۃ الملک میں ہے: {لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا} ''تاکہ اللہ تعالیٰ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرتا ہے''۔ چنانچہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کی سرشت میں اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے کی صلاحیت بھی ودیعت فرما دی۔ قرآن مجید میں ہے: {فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا}(الشمس:۸) ''پس اُس نے نفس کو برائیوں اور اچھائیوں کی پہچان سجھا دی''۔ چونکہ دنیا میں اس قدر رنگینی اور دلکشی ہے کہ انسان برائیوکو برائی جانتے ہوئے بھی ان سے مکمل طور پر بچ نہیں سکتا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے الہامی راہنمائی (Divine Guidance) کا انتظام کر دیا، جس کا مکمل، کامل اور آخری ایڈیشن قرآن مجید بنی نوع انسان کے پاس اپنی اصل اور خالص ترین صورت میں موجود ہے۔ اس میں انسان کو زندگی گزارنے کا سلیقہ بتایا گیا ہے، تاکہ وہ فسق و فجور سے بچ سکے اور تقویٰ کی روش اختیار کرنا اس کے لئے آسان ہو جائے۔ اس راہنمائی کے بغیر اس مزیّن اور لذیذ دنیا میں راہ راست پر چلنا ممکن نہیں ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی انسان کو تخلیق کیا ہے لہذا وہ اس کی صلاحیتوں سے بخوبی واقف ہے۔ چنانچہ اس نے دنیا میں زندگی گزارنے کا جو ضابطہ دیا ہے وہ عین قابل عمل اور نتائج کے اعتبار سے خوشگوار ہے۔ اس کی

راہنمائی میں زندگی گزاریں تو سکون و اطمینان بھی نصیب ہوتا ہے' آزمائش میں کامیابی کا احساس بھی ہوتا ہے اور یہ چیز دنیاوی تکالیف اور مصائب کے برداشت کو سہل بھی بنا دیتی ہے۔ قرآن مجید :

میں ہے :

{مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَ هُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ}(النحل:۹۷)

''جس نے نیک عمل اپنایا' چاہے وہ مَرد ہو یا عورت 'اور ہو وہ مؤمن 'تو ہم اسے ضرور (دنیا میں)پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے''۔

یہ پاکیزہ زندگی ہی کامیاب زندگی ہے ۔چنانچہ اس کے حصول کے لئے خالق کا تجویز کردہ انداز اختیار کرنا ضروری ہے جو کہ انسان کی فطرت کے قریب ترین ہے ۔ اس تحریر کا یہی موضوع ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کو زندہ رہنے کے لئے سب سے زیادہ ضرورت کھانے پینے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے سے نہیں روکا۔ زمین سے پیدا ہونے والی ہر شے بطور خوراک استعمال کی جا سکتی ہے ۔ہاں 'حیوانات میں سے بعض کا گوشت کھانے سے منع کیا گیا ہے' اور وہ بھی اس لئے کہ ایک تو اُن کا گوشت صحت انسانی کے لئے مضر ہے اوردوسرے ان کے کھائے بغیر انسان کا گزارا ہو سکتا ہے۔ مشروبات میں ہر طرح کا مشروب استعمال کرنے کی اجازت ہے 'صرف شراب حرام قرار دی گئی جو عقل کو ماؤف کر دیتی ہے اور انسان اچھائی اور برائی کی تمیز سے عاری ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے ایسی چیز کے استعمال پر پابندی خود انسان کے اپنے مفاد میں ہے۔ پھر یہ کوئی ایسی شے نہیں ہے کہ جس کے بغیر گزارا نہ ہو سکے۔

روزی کے حصول کے لئے صاف اور شفاف اصول دیئے گئے ہیں ۔ دھوکہ دہی' بددیانتی ' رشوت' چور بازاری' ذخیرہ اندوزی وغیرہ جیسے کاموں کے ذریعے کمائی ہوئی دولت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ان ذرائع سے دولت کمانے والا معاشرے کے دوسرے افراد کے ساتھ ظلم و زیادتی کا مرتکب ہوتا ہے جس کے بُرا ہونے پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

دنیا میں ہر شخص کی خواہش ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ سہولیات میسر ہوں۔ یہ

انسانی فطرت ہے۔ چنانچہ سہولتیں حاصل کرنے کی جدوجہد پر کوئی پابندی نہیں۔ اچھے سے اچھا کھائو' اچھے سے اچھا پہنو' پُر آسائش رہائش گاہ میں سکونت اختیار کرو 'اچھی سواری رکھو 'کوئی ممانعت نہیں۔ ممانعت صرف اس بات کی ہے کہ یہ سب کسب حلال سے حاصل کیا گیا ہو اور نمود و نمائش کا جذبہ اور دوسروں کے مقابلے میں اپنی برتری جتانا مقصود نہ ہو' بلکہ مقصود یہ ہو کہ دنیاوی نعمتوں کے استعمال کے ساتھ صحت وتندرستی حاصل رہے اور اللہ کی عبادت

کے لئے زیادہ سے زیادہ موزوں ماحول میسر آسکے۔

گناہوں سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے لیکن اس کے لئے رہبانیت کی راہ اختیار کرنے سے روک دیا گیا ہے ‘کیونکہ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ انسان معاشرتی حیوان ہے۔ اگر اسے معاشرے سے الگ تھلگ تنہائی میں رکھا جائے تو یہ اس کے لئے دنیاوی زندگی میں بدترین سزا ہے۔ لہٰذا اسلام ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ ابنائے نوع کے اندر رہتے ہوئے اور فطری تقاضوں کو جائز راستے سے پورا کرتے ہوئے بھرپور زندگی گزارو۔ بیوی بچوں اور دوست واحباب سے کٹ کر زندگی گزارنا گناہ کی بات ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جو رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات منقطع کرلے۔

دنیا کی زندگی میں انسان کی کئی حیثیتیں ہیں ۔وہ بیٹا ہے تو اسے ماں باپ کی خدمت‘ اطاعت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے جن ہستیوں نے اس کی پرورش کی‘ اپنا آرام و راحت اس پر قربان کرتے رہے ‘ان کی خدمت اور اطاعت تو عین فطری بات ہے۔ پھر کل کو آج کے بچے ماں باپ بنیں گے تو انہیں بھی یہ موقع حاصل ہوگا کہ ان کی اولاد اُن کی خدمت کرے۔

اگر انسان بڑی عمر کا ہے تو اسے ہدایت ہے کہ چھوٹوں پر شفقت کرے کہ وہ اس کے مستحق ہیں ۔ بڑوں کا فرض ہے کہ وہ نرمی اور رفق و محبت کے ساتھ چھوٹوں کو اچھی تعلیم دیں تاکہ وہ کامیاب زندگی کی راہ پر گامزن ہوں۔ ان باتوں پر عمل پیرا ہونے کی اہمیت اس حدیث سے واضح ہے:

((مَنْ لَمْ یَرْحَمْ صَغِیْرَنَا وَیَعْرِفُ حَقَّ کَبِیْرِنَا فَلَیْسَ مِنَّا)) (ترمذی و ابوداؤد)

’’جس شخص نے ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کیا اور ہمارے بڑوں کا حق نہیں پہچانا وہ ہم میں سے نہیں ہے ‘‘۔

گویا تمام اسلامی اخلاقی تعلیم انتہائی نتیجہ خیز ہے اور معاشرے میں امن و سکون کا باعث ہے۔ جو شخص ان تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھتا ہے‘ اس کا دل مطمئن اور روح پرسکون ہو جاتی ہے۔

دنیا کی زندگی میں خوشی کے مواقع بھی آتے ہیں اور غمی کے بھی۔ اسلامی تعلیمات خوشی کے موقع پر خوشی کے اظہار سے نہیں روکتیں کہ یہ فطری تقاضا ہے۔ بیٹے کی شادی کا موقع والدین اور عزیز و اقارب کے لئے خوشی کا موقع ہے۔ اس موقع پر دولہا کی طرف سے دعوتِ ولیمہ کے انعقاد کی ترغیب دی گئی ہے تاکہ وہ اپنے عزیز و اقارب اور دوست و احباب کو اپنی خوشی میں شریک کرسکے۔ البتہ اس موقع پر فضول رسومات کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے جہاں صاف طور پر اسراف و تبذیر involveہوتا ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر حلال و طیب کمائی نام و نمود اور

شہرت کی خاطر خرچ کرنے سے منع کیا گیا ہے کہ اس سے ناداروں اور مفلسوں کی حق تلفی بھی ہوتی ہے اور دل شکنی بھی۔ یوں ایسا آدمی معاشرے میں اونچ نیچ پیدا کر کے نفرت کا بیج بوتا ہے جو ہرگز مستحسن نہیں۔

موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ کسی گھر میں موت ہو جائے تو اہل خانہ پر صدمے کی کیفیت طاری ہونا ایک فطری امر ہے۔ چنانچہ ایسے موقع پر غمگین ہونے اور غم کے آنسو بہانے سے نہیں روکا گیا بلکہ نماز جنازہ کے ذریعے میت کی مغفرت کے لئے دعا کرنا مسنون قرار دیا گیا۔ اور یہ نہ صرف زندوں کے لئے صبر و سکون کا باعث ہے بلکہ فوت ہونے والے کے لئے بھی مفید ہے۔ البتہ اس غم کے موقع پر بھی نام و نمود کے لئے بڑی بڑی دعوتیں پکانا اور کئی دن تک سوگ کی حالت میں رہنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ تعلیم یہ دی گئی ہے کہ کسی فرد کی وفات کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہوا۔ {كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ} یہاں ہر نفس پر موت آئے گی' یہ اللہ کا اٹل فیصلہ ہے۔ صدمہ تو فطری امر

ہے 'اس کو نہیں دبایا گیا 'البتہ حد سے بڑھنے یعنی بے صبری کے مظاہرے سے منع کیا گیا ہے۔ اس صدمے کو صبر اور حوصلے کے ساتھ برداشت کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ تعزیت صرف تین دن تک ہے 'اس کے بعد لواحقین اپنے اپنے کام کاج میں مصروف ہو جائیں اور اللہ کی رضا پر راضی ہو جائیں۔ اس طرز عمل پر وہ بے حساب اجر و ثواب کے مستحق بھی ہوں گے۔ میت کو سادہ سی قبر میں دفن کرنے کا حکم ہے 'قبر کو پختہ کرنے سے منع کیا گیا ہے کہ اس میں پیسہ بھی خرچ ہوتا ہے جو ہر شخص برداشت نہیں کر سکتا۔ پھر اس سے میت کا کوئی نفع وابستہ نہیں ہوتا 'کیونکہ قبر میں تو اس کے نفع ونقصان کا دارومدار اس کے اچھے برے اعمال پر ہے۔ قبروں کو چونا گچ کے ساتھ خوبصورت بنانے اور قائم رکھنے کی اجازت نہیں۔ اس سے کئی بدعات اور مفاسد جنم لیتے ہیجو ٹھوس اور پختہ عقائد سے روگردانی کا باعث بن کر گمراہی کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں۔

دین میں عبادات کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں۔ عبادات کا دوسرا نام حقوق اللہ ہے۔ جہاں اسلام میں حقوق العباد کی ادائیگی پر زور دیا گیاہے وہاں عبادات کی پابندی کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ اسلامی عبادات تمام کی تمام ایسی ہیں کہ وہ آدمی کے اخلاق و کردار کو اس درجہ سدھار دیتی ہیں کہ وہ ایک اچھا انسان بن جاتا ہے اور اس کے لئے حقوق العباد کی ادائیگی آسان ہو جاتی ہے۔ اسلام میں عبادات کا نظام بھی اعتدال پر مبنی ہے۔ ایک دن میں پانچ نمازیں فرض ہیں۔ ہر نماز چند منٹ کی مصروفیت ہے جس میں انسان پاک صاف ہو کر اللہ کی یاد میں لگ جاتا ہے۔ اپنے خالق و مالک کی حمد وثنا کرتا' اپنے نبی کریم ﷺ پر دورد پڑھتا' اپنے اور اپنے اہل و عیال بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے بھلائی مانگتا اور گناہوں کی بخشش کی استدعا کرتا ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ وقفے وقفے سے اللہ کے حضور حاضری اللہ کے ساتھ عبدیت کے رشتے کو مضبوط کرتی اور اسے ہر طرح کے گناہوں سے باز رکھتی ہے۔

سال میں ایک ماہ کے روزے فرض کئے گئے ہیں۔ اس مہینے میں صبح سے شام تک بھوک پیاس برداشت کرنا اور شہوانی خواہش پوری کرنے سے رکنا ہوتا ہے۔ چند گھنٹوں

30

کا یہ وقفہ کچھ مشکل تو ہوتا ہے مگر یہ تربیت انسان کے کردار میں بلندی اور جذبات میں توازن پیدا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ روزہ بہت سی بیماریوں کے ازالے کا باعث بھی بنتا ہے' کیونکہ یہ انسانی معدے پر کام کا بوجھ کم کر کے اسے طاقتور اور توانا بناتا ہے۔ سال میں ایک ماہ کے روزے مشقت کا باعث نہیں اور پھر بھوک وپیاس کا وقفہ بھی زیادہ لمبا نہیں کہ عام آدمی برداشت نہ کر سکے ۔ نماز اور روزے کی اہمیت اپنی جگہ مگر مریض اور مسافر کے لئے حالات کے مطابق نرمی رکھی گئی ہے۔ لمبے سفر میں نماز قصر ہے جبکہ روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور بیماری کی حالت میں کھڑے ہونے کے بجائے لیٹ کر یا محض اشارے کے ساتھ بھی نماز پڑھی جا سکتی ہے اور روزہ نہ رکھنا جائز ہے جو بیماری یا سفر کی صعوبت کے بعد پھر رکھا جا سکتا ہے۔ یعنی اسلام کا کوئی حکم ایسا نہیں جو انسانی فطرت کے ساتھ متصادم اور تکلیف مَالَا یُطَاقُکا مظہر ہو۔ نماز کے لئے وضو ضروری ہے 'لیکن اگر پانی میسر نہ ہو یا بیماری کے باعث پانی کا استعمال نقصان دہ ہو تو مٹی کے ساتھ تیمم کی اجازت ہے جو وضو کا قائم مقام ہے۔

انسان کے اندر شہوانی جذبات بڑے مُنہ زور اور شدید ہیں۔ چنانچہ اسلام ان جذبات کو نہ کچلتا ہے اور نہ دباتا ہے 'بلکہ channelize کرتا ہے۔ ان جذبات کی تسکین کے لئے نکاح کا راستہ ہے جو مرد اور عورت دونوں کے سکون و اطمینان کا باعث ہے۔ نکاح سے فرار یعنی تجرد کی زندگی بعض دوسرے مذاہب میں قابل تعریف ہے مگر فطرت کے ساتھ متصادم ہونے کی وجہ سے اسلام میں جائز نہیں' بلکہ یہاں تو نکاح کو مسنون عمل قرار دیا گیا ہے اور بیوی بچوں کے جائز حقوق و مطالبات کا پورا کرنا اجر و ثواب کا باعث بتایا گیا ہے۔ رسول اللہ 'صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے نکاح کو اپنی سنت قرار دیا ہے اور جو شخص سنت سے اعراض کرے اس کے بارے میں آپ 'صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے فرمایا کہ اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

بعض اوقات جسمانی ضرورت یا اولاد کی طلب ایک سے زیادہ بیویوں کا تقاضا کرتی ہے جو ایک فطری امر ہے ۔چنانچہ ایک مَرد کے لئے چار تک بیویاں رکھنے کی

31

اجازت ہے۔ ہاں اُن سب کے حقوق برابری کے اصول پر ادا کرنے ہوں گے اور یہ بات عدل وانصاف پر مبنی ہے۔ جس معاشرے میں صرف ایک ہی بیوی کی اجازت ہے وہاں بعض افراد جو غیر معمولی جذبات کے حامل ہوتے ہیں' عدم تشفی کا شکار ہو کر اِدھر اُدھر مُنہ مارتے' داشتائیں رکھتے اور فحاشی و بے حیائی پھیلاتے ہیں' مگر اسلام اس کا مثبت حل پیش کرتا ہے اور فطری تقاضوں کو غیر ضروری حد تک دبانے کی اجازت نہیں دیتا۔

اسلام مالداروں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ زائد از ضرورت مال و زر میں سے ایک مقررہ حصہ غرباء و مساکین، نادار اور ضرورت مندوں کو دیں تاکہ ان کی گزر بسر ہو سکے اور وہ نہ تو بھوک کے ہاتھوں مجبور ہوں اور نہ وہ بھیک مانگیں۔ زکوۃ اُس مال پر ہے جو سال بھر کسی کے پاس فارغ پڑا رہے۔ پھر اس میں سے صرف چالیسواں حصہ مستحقین اور ضرورت مندوں میں تقسیم کرنا ہے جو کوئی بڑی رقم نہیہے۔ اگر نصف یا چوتھائی مال دینے کا حکم ہوتا تو انسانی طبیعت پر بوجھ ہوتا، لیکن چالیسواں حصہ تو اتنی قلیل مقدار ہے جس کا خرچ کرنا آسانی کے ساتھ قابل برداشت ہے۔ پھر اس میں بھی یہ تعلیم ہے کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو فوقیت دی جائے۔ گویا ہر صاحب مال اپنے عزیز و اقارب کی ضروریات کا خیال رکھے۔ اگر ایسا ہو گا تو کوئی ضرورت مند بے بسی اور بے چارگی کی زندگی گزارنے پر مجبور نہ ہو گا۔

اسلام کا ایک رکن حج بیت اللہ ہے جو ہر اُس مسلمان پر فرض ہے جو خانہ کعبہ تک سفر کی مشقت اور اخراجات برداشت کر سکتا ہو ۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کی عدم موجودگی میں اس کے گھر کی اندرونی اور بیرونی ضروریات پوری کرنے کا بھی انتظام ہو۔ ایسے آدمی پر زندگی میں ایک مرتبہ چنددن کے لئے مکہ مکرمہ جانا اور مناسکِ حج ادا کرنا لازم ہے۔جہاں یہ عبادت تقربِ الٰہی کا موجب ہے وہاں حج کے موقع پر لاکھوں فرزندانِ توحید کا یہ اجتماع شانِ اسلام کا مظہر ہی نہیں ہوتا بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو باہم مصاحبت اور مشاورت کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔ اس مقدس فریضے کی ادائیگی میں غیر معمولی مشقت اور بھاری اخراجات اٹھتے ہیں تو اس کا اجر و ثواب بھی دیکھئے کہ آپ، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ نے فرمایا:

''جس آدمی نے حج کیا اور اس میں نہ تو کسی شہوانی اور فحش بات کا ارتکاب کیا اور نہ اللہ کی کوئی نافرمانی کی تو وہ گناہوں سے ایسا پاک و صاف ہو کر واپس ہو گا جیسا اُس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اس کو جنا تھا۔'' (بخاری و مسلم)

تہوار منانا، خوشی کا اظہار کرنا، زیب و زینت اختیار کرنا بھی فطری تقاضا ہے۔ چنانچہ اسلام میں دو مقدس تہوار عید الفطر اور عید الاضحی ہیں۔ ایک تو رمضان المبارک کے روزوں کی تکمیل پر اظہارِ خوشی کا موقع ہے اور دوسرا جدّالانبیاء حضرت ابراہیم ں کے اس یادگار فعل کی یاد تازہ کرتا ہے جب انہوں نے اللہ کے حکم کی تعمیل میں اپنےپیارے بیٹے اسماعیل کو قربانی کے لئے پیش کر دیا۔ اس دن مسلمان جانوروں کی قربانی پیش کرتے ہیں، اچھے سے اچھا کھانا کھاتے ہیں ۔گوشت وافر ہوتا ہے اس لئے اُس دن ہر غریب اور نادار کو بھی اچھا کھانا میسر آتا ہے۔ ان دونوں عیدوں کے موقع پر انفاق فی سبیل اللہ کی خصوصی ترغیب ہے۔ علاوہ ازیں ان دونوں ایّام میں دو رکعت نماز عید بھی ادا کی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں پر شکر کا اظہار ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سنجیدگی اور وقار پسندیدہ عادات ہیں مگر انسان کی طبیعت خوش طبعی اور

مزاح کا بھی تقاضا کرتی ہے۔ چنانچہ اسلام میں اس کی بھی گنجائش موجود ہے ۔خود رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں خوشگوار مزاح کی مثالیں ملتی ہیں۔ ایک بوڑھی عورت کے ساتھ گفتگو کے دوران آپؐ نے فرمایا کہ بوڑھی عورت تو کوئی بھی جنت میں نہ جائے گی۔ زبانِ وحی ترجمان سے یہ بات سن کر وہ عورت سخت پریشان ہوئی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیوں پریشان ہوتی ہو؟ جنت میں بوڑھی عورتیں بھی جوان ہو کر جائیں گی۔ جب یہ انداز سنت سے ثابت ہوا تو صحابہ کرام ث میں بھی موجود تھا۔ ایک دفعہ چند صحابی اکٹھے کھجوریں کھا رہے تھے ۔ان کو سوجھا کہ جو بھی کھجور کھاتا گٹھلی حضرت علی ص کے آگے رکھ دیتا ۔اس طرح حضرت علیؓ کے سامنے گٹھلیوں کا ڈھیر لگ گیا ۔ اس پر دوسروں نے کہا لگتا ہے علیؓ نے ہم سب سے زیادہ کھجوریں کھائی ہیں۔ یہ سن کر حضرت علیؓ کہنے لگے یہ بات نہیں بلکہ لگتا ہے کہ تم گٹھلیوں سمیت کھجوریں کھاتے رہے ہو جبکہ میں نے گٹھلیاں

نکال کر کھائی ہیں ۔اس پر سب ہنس دیئے۔

فطرتِ انسانی کو صفائی پسند ہے ۔چنانچہ اسلام صاف ستھرا رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ صفائی کو ایمان کا ایک جزو قرار دیا گیا ہے ۔ ہر نماز سے پہلے وضو لازمی شرط ہے جس میں ہاتھ، مُنہ، بازو اور پائوں دھوئے جاتے ہیں، ناک میں پانی ڈالا جاتا ہے اور گلا بھی صاف کیا جاتا ہے۔ پھر مسواک کی فضیلت بیان کر کے ہر نماز کے وضو میں مسواک کر کے دانت صاف کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ آج ہر شخص جانتا ہے کہ بہت سی بیماریاں محض دانتوں کے صاف نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہیں، کیونکہ دانتوں میں اٹکی ہوئی خوراک کے ذروں میں نقصان دہ جراثیم پیدا ہوتے ہیجو پیٹ میں پہنچ کر مختلف بیماریوں کا باعث بنتے ہیں۔ ہفتے میں ایک دن خصوصی اجتماعی نماز ہوتی ہے، یعنی نمازِ جمعہ۔ اس میں قرب و جوار کے سب لوگ شرکت کرتے ہیں ۔یوں تو مسجدوں میں بڑے بڑے اجتماع ہوتے ہیں، لیکن اس نماز کے لئے خصوصی حکم ہے کہ مسجد میں آنے سے پہلے غسل کیا جائے، مسواک کی جائے، اچھے صاف ستھرے کپڑے پہنے جائیں اور خوشبو بھی لگائی جائے ۔ اس طرح اس بڑے اجتماع کو ہر قسم کی ناگوار مہک سے پاک اور خوشبو کے ذریعے خوشگوار بنایا جاتا ہے۔

اسلام کا ہر حکم افراط و تفریط سے پاک ہے۔ اللہ کا ذکر، تلاوتِ قرآن، نماز و روزہ انتہائی فضیلت کی حامل عبادات ہیں، مگر اِن میں بھی توازن و اعتدال کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ ان پسندیدہ عبادات کو اس حد تک اختیار کرنے کی اجازت ہے کہ دوسرے ضروری اعمال و افعال متاثر نہ ہوں اور نہ ہی معاشرے کے دوسرے افراد خصوصاً اہل خانہ اور عزیز و اقرباء کے حقوق تلف ہوں۔ نفلی نماز اور تلاوتِ قرآن اُس وقت تک کریں جب تک اس میں دل لگے۔ اگر نیند آنے لگے تو طبیعت پر جبر کر کے تلاوت میں مصروف رہنے کی ممانعت ہے۔ اسی طرح

پیشاب یا پاخانے کی حاجت ہو ‘یا بھوک لگ رہی ہو اور کھانا بھی تیار ہو‘ تو ایسی صورت میں پہلے پیشاب پاخانے سے فارغ ہونے اور بھوک کی صورت میں پہلے کھانا کھانے کا حکم ہے‘ بعد ازاں دِل جمعی کے ساتھ نماز ادا

کرنے کی ہدایت ہے۔

روزہ رکھنا پسندیدہ عبادت ہے ‘مگر نفل روزے اتنی تعداد میں ہی رکھنے کی اجازت ہے جس سے بیوی بچوں کے حقوق تلف نہ ہوں اور نہ ہی اپنی صحت متاثر ہو۔بیوی کو نفل روزہ میں خاوند کی اجازت کا پابند بنانا بھی گہری حکیمانہ تعلیم ہے ۔دوسروں کے حقوق کے اتلاف کا اس قدر خیال رکھنے کا حکم ہے کہ اُس جگہ بلند آواز سے قرآن مجید کی تلاوت کی اجازت نہیں جہاں لوگوں کا تلاوت کے لئے ہمہ تن گوش ہونا ممکن نہ ہو۔

شادی بیاہ کے موقع پر اسلام سادگی کی تعلیم دیتا ہے ۔بہتر ہے کہ نکاح مسجد میں ہو اور پاکیزہ ماحول کے اندر دلہا‘ دلہن کی کامیاب ازدواجی زندگی کے لئے اجتماعی دعا کی جائے۔ شادی کے موقع پر دلہا کے ہاں تو اظہارِ خوشی کے لئے عزیز و اقارب کی دعوت ہو گی‘ جسے ولیمہ کہتے ہیں‘ مگر دلہن کے ہاں کسی قسم کی تقریب منعقد نہ ہونی چاہیئے ۔نہ تو ان کے ہاں بارات آئے کہ اسے کھانا کھلانے کا اہتمام کیا جائے اور نہ ہی والدین پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بیٹی کو جہیز دیں۔یوں تو دلہن کے والدین کو بیٹی کو رخصت کرتے وقت جدائی کے غم کے ساتھ ساتھ فرض سے سبکدوش ہونے کا خوشگوار احساس بھی ہوتا ہے ‘مگر اس موقع پر ان پر کسی طرح کی دعوت وغیرہ کا کچھ بار نہیں ڈالا گیا۔ البتہ بیٹی والدین کی جائیداد سے وراثت کی حق دار ضرور ٹھہرائی گئی ہے۔ اگر وراثت تھوڑی ہے تو وہ تھوڑا حصہ پائے گی ‘زیادہ ہے تو زیادہ حصہ پائے گی۔ اس کا حصہ وراثت میں مقرر ہے۔

اسلام میں رات کو جاگ کر اللہ کی حمد وثنا ‘ نماز اور ذکر اذکار کی بڑی فضیلت ہے ‘مگر یہاں بھی افراط و تفریط ہرگز پسندیدہ نہیں۔ رات آرام کے لئے ہے‘ لہٰذا پسندیدہ طرزِ عمل یہ ہے کہ رات کو اتنی دیر جاگ کر عبادت کی جائے جس سے صحت متاثر نہ ہو اور صبح اٹھ کر آدمی دن بھر کے کام کاج کرنے کے قابل رہے۔ ایسا نہ ہو کہ شب بیداری کے نتیجہ میں وہ سارا دن اونگھتا رہے اور روز مرہ کے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کا مرتکب ہو جائے ۔ شب بیداری کے سلسلہ میں جہاں اپنے جسمانی حقوق کا خیال رکھنا ضروری ہے وہاں بیوی بچوں کے حقوق خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرنے میں کوتاہی کی بھی ہرگز

اجازت نہیں۔

الغرض دین اسلام میں تمام احکام ایسے ہیں کہ ان میں افراط و تفریط کہیں نظر نہیں آتی۔ اس کی تعلیمات فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہیں۔ انسانی طبیعت کی فطری کمزوریوں کو ہر وقت پیش نظر رکھا گیا ہے۔ کوئی حکم اور

ضابطہ ایسا نہیں جس پر عمل کرنا ناممکن ہو یا وہ انسانی ہمت و صلاحیت سے ماوراء ہو۔ ایسا متوازن اور معتدل ضابطۂ حیات صرف دین اسلام ہی ہے' کیونکہ اسے بنانے والا خود وہ خالق ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور جو اس کی کمزوریوں اور صلاحیتوں سے پوری طرح باخبر ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ انسانوں کے حق میں رحمن و رحیم ہے۔ چنانچہ اصولاً وہ لوگوں کے لئے آسانی چاہتا ہے تنگی نہیں چاہتا۔ سورۃ البقرۃ میں ارشادِ الٰہی ہے :

{یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ} (آیت ۱۸۵)

''اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے' وہ تمہارے لئے تنگی نہیں چاہتا۔''

اسی بنیادی تعلیم کے تحت ہر مسلمان کے لئے لازم ہے کہ دوسروں کے لئے ہر ممکن حد تک آسانی پیدا کرے اور سختی سے باز رہے۔

ooo

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات

اسلام بلاشبہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور پیغمبر اسلام ﷺ کے دورِ نبوت اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پوری طرح جلوہ گر نظر آتا ہے ۔ لیکن آج مسلمان اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر تسلیم تو کرتے ہیں لیکن خود اپنے عمل سے اس کی نفی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو وہ اسلامی تعلیمات سے واقف نہیں اور جدید علوم حاصل کر کے ان کی چمک دمک سے مرعوب ہو گئے ہیں اور مختلف نظریۂ ہائے زندگی کی تعریف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں 'یا خود اسلام کے اصولوں کو قابلِ ترمیم سمجھتے ہوئے اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق انہیں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ شاید انہیں یہ بات بھول جاتی ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ (خالقِ کائنات) کا پسندیدہ طرزِ زندگی ہے۔ چونکہ اللہ ربّ العزت ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے اس لیے اس نے جو دین بنی نوع انسان کے لیے پسند کیا وہ بھی بے عیب ہو گا۔ نیز یہ کہ اسی اسلام کو بطور دین کے پیغمبر ﷺ نے خود

بالفعل نافذ کر کے مسلمانوں کے حوالے کیا۔ اور آپؐ کے خلفائے راشدین نے بھی اُس کو اپنے اپنے دورِ خلافت میں جاری رکھا اور تاریخِ عالم نے دیکھا کہ امن و سکون، خوشحالی اور فارغ البالی میں وہ دور اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

آج خود مسلمان اسلام سے مطمئن نہیں۔ لاتعداد فرقے پیدا ہو چکے ہیں جو اسلام کے چہرے پر بدنما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دی جائے تو وہ حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ اسلام کے کس فرقے میں شامل ہوں۔ یہ صورت حال اس لیے پیدا ہوئی کہ خود مسلمان مختلف اغراض و مقاصد کے حصول میں اس حد تک منہمک ہو گئے کہ اسلامی تعلیمات کے سرچشموں کو فراموش کر بیٹھے۔ اسلام میں ذاتی پسند کی چیزوں کو داخل کر دیا اور اس طرح مسخ شدہ اسلام کے حامل بن کر ہر قسم کی برکات

سے محروم ہو گئے۔

قرآن حکیم میں اسلامی تعلیمات کا اوّلین ماخذ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور فرقہ بندی نہ کرو''۔ مسلمانوں نے فرقہ بندی کر کے حکم الٰہی کی خلاف ورزی کی۔ چنانچہ نتیجہ ظاہر ہے کہ ہر مسلمان کسی نہ کسی فرقے سے متعلق ہے اور وہ اپنے مخصوص فرقے کو ہی اسلام سمجھتا ہے حالانکہ اُس کی غلطی واضح ہے۔ صحابہ کرامؓ صرف مسلمان تھے۔ ان کا کوئی فرقہ یا ٹولہ نہ تھا۔ انہوں نے اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔ اُن کے سامنے رسول پاکؐ کا فرمان موجود تھا: ''میں تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، جب تک تم اُن کو اختیار کیے رکھو گے گمراہ نہ ہو گے: ایک کتاب اللہ، دوسری میری سنت''۔ صحابہ کرامؓ نے قرآن و سنت کے اتباع کی جو مثالیں قائم کی ہیں وہ اسلامی تاریخ کا درخشندہ باب ہے لیکن یہاں طوالت کی خاطر اس سے صرفِ نظر کیا جا رہا ہے۔

خلفائے راشدین کے بعد کے لوگوں کے لیے آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''تم پر لازم ہے کہ میرے طریقے پر چلو اور خلفائے راشدینؓ کی راہ اختیار کرو''۔ اللہ تعالیٰ کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے خلفائے راشدین پر کہ جنہوں نے پیغمبر اسلامؐ کے اعتماد کو ذرّہ برابر ٹھیس نہ پہنچائی اور اپنے زمانے میں سنّتِ نبویؐ پر سختی سے عمل پیرا رہے اور کسی ایسی چیز کو اسلام میں داخل نہ کیا جو آنحضرت ﷺ نے اسلام میں شامل نہ کی تھی۔ اس طرح وہ دین اسلام کو خالص حالت میں چھوڑ کر رخصت ہوئے۔

اُصولی طور پر تو اسلام کی تکمیل بطور ضابطۂ حیات خود ربّ العزت نے فرما دی جب آنحضرت ﷺ کی زندگی کے آخری ایام میں یہ اعلان کیا گیا کہ ''آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور میں نے تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور میں نے تمہارے لیے اسلام کو بطور دین (ضابطۂ حیات) پسند کیا''۔ یوں

اللہ تعالیٰ نے ضابطۂ حیات مکمل اور تمام صورت میں مرحمت فرمایا اورپیغمبر اسلامؐ نے اُس کو نافذ کیا۔ لیکن اُمت کی بد قسمتی کہ نظری طور پر تو دین کو مکمل ضابطۂ حیات تسلیم کیا مگر اُس کی سادگی، سہولت اور خلوص کو

قائم نہ رکھا۔پیچیدہ رسمیں، مشکل ریاضتیں اور عجیب و غریب بدعات خود اپنی طرف سے گھڑ کر انہیں دین کا اہم جزو قرار دیا اوریوں بالفعل یہ ظاہر کیا کہ اسلام جو رسولؐ اور اُس کے اصحاب نےپیش کیا وہ مکمل دین نہ تھا بلکہ ابھی اُس میں بہت سی باتوں کا اضافہ کیا جاسکتا ہے ۔بس مسلمانوں کی اجتماعیت کے لیے اصولوں سے انحراف زہر قاتل ثابت ہوااور ہونا تھا، اس طرح مسلمان گروہ در گروہ ہو کر حق و باطل کی طرح ٹکرانے لگے۔

کاش کہ مسلمان قرآنی تعلیمات کو فراموش نہ کرتے اور اسلام کو اس کی خالص شکل میں رکھتے اور فرمانِ نبویؐ کو قولِ فیصل جانتے تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی: ''اگر کسی بات میں تمہارا جھگڑا ہو جائے پس اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹائو''۔یعنی وہاں سے راہنمائی حاصل کرو۔

ہر مسلمان یہ جانتا ہے کہ تکمیل دین کی آیت کے نزول کے وقت اور خلفائے راشدین کے مبارک ادوار میں صحابہ کرامؓ کی قبریں کچی تھیں ۔نہ اُن کو غسل دیا جاتا تھا، نہ اُن پر غلاف چڑھائے جاتے تھے، نہ وہاں پیسے ڈالنے کے لیے صندوق ہوتے تھے، نہ وہاں روشنی کی جاتی تھی ، نہ اُن پر گنبد بنائے جاتے تھے، نہ درگاہیں تعمیر ہوتی تھیں، نہ متولی بیٹھتے تھے، نہ عرس ہوتے تھے اورنہ میلے۔ البتہ قبروں پر جا کر اپنی موت کو یاد کرنا اور فوت شدگان کے حق میں دعائے مغفرت کرنا معمول تھا۔ خود آنحضرت ﷺ قبرستان میں تشریف لے جاتے اور اہل قبور کے حق میں دعائے مغفرت فرماتے ،حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ منع فرمایا ہے رسول اللہ ﷺ نے قبروں کو پختہ کرنے سے، ان پر عمارت بنانے سے اور ان پر بیٹھنے سے۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا:''اللہ کی لعنت ہے قبروں پرچراغ جلانے والوں پر''۔ آپؐ کے ان فرامین پر عہد نبویؐ میں عمل رہا اور خلافتِ راشدہ میں بھی قبروں پر گنبد تعمیر نہ کیے گئے۔ یہی چیز کتب تواریخ سے ثابت ہے۔ اب مسلمانوں کا عمل ملاحظہ ہو کہ آنحضرت ﷺ کے اُسوہ اور خلفائے راشدین کے طریقہ کے خلاف قبریں پختہ بن رہی ہیں ان پر گنبد بنائے جا رہے ہیں، درگاہیں تعمیر ہو رہی ہیں، متولی بیٹھے ہیں، عرس اور میلے ہو رہے ہیں، قبروں کو غسل دیا جا رہا ہے، غلاف چڑھائے جا رہے ہیں اور وہاں منتیں

مانی جا رہی ہیں۔

یہ ایک مثال ہے علاوہ ازیں بدعات کا ایک وسیع سلسلہ ہے جو مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو میں شامل ہے اور سنت رسولؐ کے متوازی ایک دوسرا سلسلہ قائم ہے۔ بچے کی پیدائش کی رسومات، وفات پر مختلف ناموں پر اجتماع، نکاح کے موقعہ پر فضول رسمیں اور اُسوہ حسنہ کی خلاف ورزی، شب برات، معراج شریف اور لیلۃ

القدر کے خود ساختہ پروگرام' میلاد النبیؐ کے نام پر عید۔ الغرض اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات قرار دینے والے خود نئی نئی چیزیں دین میں شامل کر رہے ہیں اور علمائے حق کا وہ گروہ جو اُن کی اِن بدعات کے خلاف آواز بلند کرتا ہے اور دین کو اُسوۂ رسولؐ اور عملِ صحابہؓ کے مطابق دیکھنا چاہتا ہے اُسے برا بھلا کہتے ہیں حالانکہ خود آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے ہمارے اس دین میں ایسی کوئی نئی بات نکالی جو اس میں نہیں ہے بس وہ مردود ہے۔ نیز ''سب سے بہتر بات خدا کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ حضرت محمدؐ کا طریقہ ہے اور بدترین چیز وہ ہے جو دین میں نئی پیدا کی گئی ہو اور ہر بدعت گمراہی ہے''۔ بدعت کو آپؐ نے اس لیے بدترین عمل قرار دیا کہ دین میں اضافہ جائز سمجھنے والا دراصل تکمیل دین کی نفی کر رہا ہے وہ اپنے ناقص ذہن کے ساتھ دین کو مکمل کرنے کی کوشش کر رہا ہے حالانکہ ربّ العزت اُسے مکمل کر چکا ہے۔ بظاہر بدعات کو مزین کر کے پیش کیا جاتا ہے مگر یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ اس سے دین کی سادگی اور سہولت پر زد پڑتی ہے اور دین میں سادگی اور سہولت منشائے خداوندی ہے: ''اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے تمہارے لیے آسانی کا اور نہیں چاہتا اور تمہارے لیے تنگی''۔

دین میں بدعات کے وجود کو صحیح تسلیم کرنے والے کہتے ہیں کہ ان چیزوں سے ہمارا مقصود قربِ الٰہی کا حصول ہے یعنی ہماری نیت نیک ہے لیکن وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ قربِ الٰہی کے حصول کے جو طریقے مناسب اور بھلے تھے وہ خود آنحضرت ﷺ نے سکھلا دیے ہیں اور کسی دوسرے کے لیے اس میں کوئی گنجائش

نہیں چھوڑی۔

قرآن پاک میں بدعت کی مذمت سورۃ الحدید میں مذکور ہے۔ رہبانیت اسلام میں نہیں ہے لیکن نصاریٰ نے دنیا کی شہوات اور لذائذ سے کنارہ کشی کی اور حسنِ نیت پر ترکِ دنیا اختیار کیا۔ اس طرح وہ گناہ سے بچنے کا اہتمام کرنے لگے۔ گناہ سے بچنے کا یہ اہتمام چونکہ فطرت کے تقاضوں سے متصادم تھا لہٰذا وہ لوگ اس پر قائم نہ رہ سکے اور اپنی حسنِ نیت کے باوجود غضب الٰہی کے سزاوار ہوئے۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

{ وَ رَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا } (الحدید:۲۷)

''اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کرلی ہم نے ان پر فرض نہ کی تھی مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انہوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی اور پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا۔''

اگر رہبانیت بذاتہٖ اچھی چیز ہوتی تو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام میں داخل کر دی جاتی۔ معلوم ہوا کہ بدعت کا آغاز اللہ کی خوشنودی کی خاطر ہی ہوتا ہے مگر بدعت انسانی ذہن کی پیداوار ہونے کی وجہ سے ناقص ہوتی ہے اور ایجاد کرنے والے اُس میں پیدا ہونے والی قباحتوں کو روک نہیں سکتے۔ بدعت کا انجام کے اعتبار سے ناقص ہونا اسی بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے علام الغیوب نے خود دین میں شامل نہیں کیا۔ ہر وہ عبادت بدعت کہلائے گی

جس کی ادائیگی کی نظیر رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں نہیں ملتی۔
کاش کہ مسلمان اُسوۂ رسولؐ اور خلفائے راشدین کے طریقے کو اپنائیں۔ آسان اور سہل دین پر عمل کریں اور اسلامی عبادات میں اضافے کر کے منصبِ رسالت میں مداخلت کی جسارت نہ کریں۔

إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ

توحید باری تعالیٰ سب سے بڑی حقیقت اور سچائی ہے جبکہ شرک سے بڑا کوئی جھوٹ اور غلط بیانی نہیں۔ چونکہ اسلام دین فطرت ہے اور یوں وہ ہر سچائی اور اچھائی کو قبول کرتا ہے اور جھوٹ اور برائی کو مسترد کرتا ہے۔ سب سے بڑا سچ ہونے کی وجہ سے توحید باری تعالیٰ کو اسلامی تعلیمات میں بنیادی حیثیت حاصل ہے' بلکہ جب تک کوئی شخص توحید کا اقرار نہ کرے وہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف شرک کو سب سے بڑا دروغ ہونے کی وجہ سے انتہائی مذموم اور قبیح رویہ سمجھا جاتا ہے' یہاں تک کہ مشرکوں کو ناپاک قرار دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

{اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ} (التوبۃ:۲۸)

''مشرک تو ناپاک ہیں۔''

پھر شرک کو بہت بڑا جھوٹ بھی کہا گیا ہے۔ قرآن شریف میں ہے:

{وَ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا ﴿۴۸﴾} (النساء)

''اور اللہ کے ساتھ جس نے (کسی اور کو) شریک ٹھہرایا اس نے تو (بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا اور) بڑے سخت گناہ کی بات کی۔''

برے کا نتیجہ بھی برا ہوتا ہے' چنانچہ ایک دوسرے مقام پر قرآن پاک میں بتایا گیا ہے کہ مشرک کو شرک کی وجہ سے ابدی اور حقیقی زندگی میں راحت اور آرام نہیں ملے گا بلکہ وہ اس جرم کے بدلے میں آگ میں پڑا رہے گا اور کسی طرف سے کوئی بھی اس کی مدد کو نہیں پہنچے گا:

{ اِنَّہٗ مَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِ الۡجَنَّۃَ وَ مَاۡوٰىہُ النَّارُ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِیۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿ ۷۲ ﴾ } (المائدۃ)
''یقیناجس نے اللہ کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہرایا اس پر اللہ نے جنت حرام

کر دی ہے اوراس کا ٹھکانہ جہنم ہے ۔اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔''

اسلامی تعلیمات میں شرک کی مذمت کے کئی پہلو اختیار کیے گئے ہیں۔ سورۂ لقمان میں شرک کو ظلمِ عظیم کہا گیا ہے۔ یعنی یہ انتہائی بے انصافی کی بات ہے۔ تمام انبیاء و رُسل نے جہاں لوگوں کو توحید پر کاربند رہنے کی تعلیم دی وہاں شرک سے دور رہنے کی بھی تلقین کی ۔ اگر کوئی شخص تھوڑی سی توجہ کے ساتھ قرآن پاک کا مطالعہ کرے تو اس پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شرک ایسا گناہ ہے کہ قیامت کے دن جس کی بخشش کی کوئی گنجائش نہیں جبکہ دوسرے تمام گناہوں کی معافی کا امکان موجود ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۴۸ کا پہلا حصہ اس طرح ہے :

{اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَ یَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ۚ}

''اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا' اس کے سوا جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔''

پس بخشش کے اعتبار سے گناہ کی دو قسمیں ہیں' ایک قابل بخشش' دوسری ناقابلِ بخشش۔ اور ناقابل بخشش گناہ صرف شرک ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۱۶ ملاحظہ ہو :

{اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَ یَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ مَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ﴿ ۱۱۶ ﴾ }

''بے شک اللہ تعالیٰ اس چیز کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے' البتہ دوسرے گناہ جس کے لیے چاہے گا معاف فرما دے گا۔ اور جس نے اللہ کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہرایا وہ تو گمراہی میں بہت دور نکل گیا''۔

گویا جوں جوں انسان شرک کی آلائش میں لتھڑتا جاتا ہے توں توں وہ جادۂ حق سے دور ہوتا جاتا ہے اور بالآخر اس کا واپس پلٹنا مشکل سے مشکل تر ہوجاتا ہے۔

شرک کی سنگینی کے اظہار کے لیے سورۃ النساء کی محولہ بالا آیات بھی کافی تھیں' مگر شرک تو ایسا گناہ ہے کہ انسانوں کو حقیقی ناکامی سے دوچار کر کے ان کے لیے بخشش کے دروازوں کی مستقل بندش کا سبب بنتا ہے اور یوں ان کو ابدی زندگی کی راحتوں کے لیے نااہل اور ناختم ہونے والی اذیتوں اور بے انتہا عذابوں کا مستحق ٹھہراتا ہے۔ اس لیے

قرآن پاک میں اس کی مذمت حد درجہ مؤثر انداز میں کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{وَ لَقَدْ اُوْحِیَ اِلَیْکَ وَ اِلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکَ ۚ لَئِنْ اَشْرَکْتَ لَیَحْبَطَنَّ عَمَلُکَ وَ لَتَکُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿ ٦٥ ﴾ بَلِ اللّٰہَ فَاعْبُدْ وَ کُنْ مِّنَ الشّٰکِرِیْنَ ﴿ ٦٦ ﴾} (الزُّمَر)

''(اے نبیؐ) تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کی طرف یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو لازماً تمہارا عمل ضائع ہو جائے گا اور تم لازماً خسارہ پانے والوں میں ہو گے' لہٰذا (اے نبیؐ) تم بس اللہ ہی کی بندگی کرو اور شکر گزار بندوں میں سے ہو جاؤ۔''

آیت کی تفسیر میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''شرک کے ساتھ کسی عمل کو عمل صالح قرار نہیں دیا جائے گا اور جو شخص بھی مشرک' رہتے ہوئے اپنے نزدیک بہت سے کاموں کو نیک سمجھتے ہوئے کرے گا ان پر وہ کسی اجر کا مستحق نہ ہو گا اور اس کی پوری زندگی سراسر زیاں کاری بن کر رہ جائے گی''۔ (تفہیم القرآن' ج ۴' ص ۳۸۲)

جس طرح ربّ العزت نے قرآن پاک میں توحید کی اہمیت اور شرک کی مذمت نہایت اہتمام سے بیان کر دی ہے اسی طرح رسول پاک ﷺ نے بھی اُمت کو توحید اختیار کرنے کی ترغیب کے ساتھ ساتھ شرک سے قطعاً دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((لَا تُشْرِکْ بِاللّٰہِ شَیْئًا وَّاِنْ قُتِلْتَ وَحُرِّقْتَ)) (مشکوٰۃ' باب الکبائر)

''کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرا' اگرچہ تو قتل کر دیا جائے یا جلا دیا جائے''۔

ایک حدیث قدسی حدیث اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے' فرمایا:

((یَا ابْنَ آدَمَ اِنَّکَ مَا دَعَوْتَنِیْ وَرَجَوْتَنِیْ غَفَرْتُ لَکَ عَلٰی مَا کَانَ فِیْکَ وَلَا أُبَالِیْ' یَا ابْنَ آدَمَ لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوْبُکَ عَنَانَ السَّمَائِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِیْ غَفَرْتُ لَکَ وَلَا أُبَالِیْ ' یَا ابْنَ آدَمَ اِنَّکَ لَوْ أَتَیْتَنِیْ بِقُرَابِ الْاَرْضِ خَطَایَا

ثُمَّ لَقِیْتَنِیْ لَا تُشْرِکُ بِیْ شَیْئًا لَأَتَیْتُکَ بِقُرَابِھَا مَغْفِرَۃً)) (رواہ الترمذی' احمد' دارمی)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''اے آدم کے بیٹے! جب تک تو مجھ سے دعا کرتا رہے گا اور مجھ سے اُمید رکھے گا میں تجھے بخشوں گا خواہ تو نے کتنا ہی برا کام کیا ہو

اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں ہے۔ اے آدم کے بیٹے ! اگر تیرے گناہ آسمان تک بھی پہنچ جائیں پھر تو مجھ سے معافی مانگے اور بخشش چاہے تو میں تجھ کو بخش دوں گا اور مجھ کو اس کی پرواہ نہ ہو گی۔ اے آدم کے بیٹے ! اگر تو مجھ سے اس حال میں ملے کہ تیرے گناہوں سے زمین بھری ہو مگر تو میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو تو میں تیرے پاس زمین بھر بخشش لے کر آئوں گا''۔

اسی طرح شرک کی ہلاکت بیان کرتے ہوئے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ لَیَغْفِرُ لِعَبْدِہٖ مَا لَمْ یَقَعِ الْحِجَابُ)) قَالُوْا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَمَا وُقُوْعُ الْحِجَاب؟ قَالَ: ((اَنْ تَمُوْتَ النَّفْسُ وَھِیَ مُشْرِکَۃٌ)) (رواہ احمد)

''اللہ تعالیٰ بخشتا ہے اپنے بندے کے گناہوں کو جب تک بندہ کے اور رحمت حق کے درمیان پردہ حائل نہ ہو''۔ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہؐ پردے کا حائل ہونا کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا:''یہ کہ آدمی شرک کی حالت میں مرے''۔

اسی طرح ایک او رحدیث میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ رسول پاک کا فرمان نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

''جو شخص خدا سے اس حال میں ملے کہ اس کے برابر کسی کو نہ مانتا ہو (یعنی شرک نہ کرتا ہو) تو وہ جنت میں داخل ہو جائے گا''۔ (رواہ البخاری و مسلم)

اس حدیث کو امام بیہقی نے ''کتاب البعث والنشور'' میں روایت کیا ہے۔ یہ چند احادیث اور اسی مضمون کی دیگر بہت سی احادیث میں بھی یہی بات بتائی گئی ہے جو قرآن پاک کی آیات بینات میں ہے کہ شرک کا گناہ ناقابل بخشش ہے جبکہ باقی تمام گناہوں

کے بخشے جانے کا امکان ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک شخص کفر کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیتا ہے' خدا کی توحید کا اقرار اور شرک سے بیزاری کا اعلان کر دیتا ہے' ارکانِ اسلام کی پابندی کرنے لگتا ہے تو ایسے شخص کو مأمون و مصئون ہو جانا چاہیے۔ اسے شرک کی سنگینی سے خبردار کرنا چہ معنی دارد! تو آیئے اس بات کے جواب کے لیے بھی قرآن پاک کی طرف رجوع کرتے ہیں:

{وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُہُمْ بِاللّٰہِ اِلَّا وَ ہُمْ مُّشْرِکُوْنَ ﴿ ۱۰۶ ﴾} (یوسف)''ان میں سے اکثر اللہ کو نہیں مانتے مگر اس طرح کہ

اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔''
اس آیت کی توضیح میں شاہ رفیع الدین محدثؒ دہلوی لکھتے ہیں:
''منہ سے سب کہتے ہیں کہ خالق مالک سب کا وہی ہے' پھر اوروں کو پکڑتے ہیں''۔
علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اپنی مقبول عام تفسیر میں اس آیت کی تفسیر اس طرح بیان کرتے ہیں:
''زبان سے سب کہتے ہیں کہ خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے مگر اس کے باوجود کوئی بتوں کو خدائی کا حصہ دار بنا رہا ہے' کوئی اس کے لیے بیٹیاں تجویز کرتا ہے' کوئی اسے روح و مادہ کا محتاج بناتا ہے۔ کسی نے احبار ورہبان کو خدائی کے اختیارات دے دیے ہیں۔ بہت سے تعزیہ پرستی' قبر پرستی' پیر پرستی کے خس و خاشاک سے توحید کے صاف چشمہ کو مکدر کر رہے ہیں۔ ریا اور ہوا پرستی سے تو کتنے موحدین ہیں جو پاک ہوں گے''۔
پس واضح ہوا کہ توحید کا اقرار کر کے دین اسلام میں داخل ہو جانے کے بعد شرک سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول پاک ﷺ اپنے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو شرک سے اجتناب کرنے کی تاکید کرتے تھے' ورنہ ان سے بڑھ کر توحید کا اقرار کرنے والا کون ہو گا! حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا:
يَا نَبِيَّ اللهِ حَدِّثْنِيْ بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِيَ الْجَنَّةَ... قَالَ نَبِيُّ اللهِ ﷺ : ((بَخٍ بَخٍ لَقَدْ سَأَلْتَ بِعَظِيْمٍ ... وَإِنَّهُ لَيَسِيْرٌ عَلٰى مَنْ أَرَادَ اللهُ بِهِ الْخَيْرَ ...

تُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَتُقِيْمُ الصَّلٰوةَ وَتَعْبُدُ اللهَ وَحْدَهٗ لَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا حَتّٰى تَمُوْتَ وَأَنْتَ عَلٰى ذٰلِكَ...)) (رواہ احمد' ترمذی' ونسائی)
''اے اللہ کے نبی ﷺ مجھے کوئی ایسا کام بتا دیجیے جو مجھے جنت میں لے جائے... آپؐ نے فرمایا: ''بہت خوب' بہت خوب' تو نے بڑی بات پوچھی (تین بار فرمایا)۔ جس کے لیے خدا بھلائی کا ارادہ کرے اُس کے لیے کچھ اتنی دشوار بھی نہیں''... آپؐ نے فرمایا: ''اللہ اور آخرت کے دن پر یقین رکھو' نماز پڑھو' اللہ کی عبادت کیا کرو' اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ یہاں تک کہ اسی حال پر تمہاری موت آجائے...''
اگر ایمان باللہ کے بعد کسی مسلمان کے لیے شرک کا امکان ختم ہو جاتا تو رسول اللہ ﷺ اس حدیث میں جلیل القدر صحابی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو دخولِ جنت اور بُعد عن النار کے لیے شرک سے اجتناب کرنے کو کیوں کہتے؟ معلوم ہوا کہ ایک مسلم اور مؤمن کے لیے اقرارِ توحید باری تعالیٰ کے بعد شرک سے علیحدگی ضروری ہے' ورنہ اس کے نیک اعمال بھی نتیجہ خیز نہ ہوں گے اور نہ ہی اسے جہنم سے بچا سکیں گے۔ قرآن پاک کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک کی آمیزش والی توحید تو کفارِ مکہ کے پاس بھی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهَاۤ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿ ۸۴ ﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿ ۸۵ ﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ﴿ ۸۶ ﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿ ۸۷ ﴾ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّ هُوَ يُجِيْرُ وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿ ۸۸ ﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ؕ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ﴿ ۸۹ ﴾ } (المؤمنون)''(اے نبیؐ) کہہ دیجیے کس کی ہے زمین اور جو کوئی اس میں ہے اگر تم جانتے ہو؟ اب کہیں گے اللہ کا ہے۔ تو کہیے پھر کیا تم سوچتے نہیں؟ پوچھئے (ان سے) کون ہے مالک ساتوں آسمانوں کا اور مالک اس بڑے تخت کا؟ اب بتائیں گے اللہ ۔ تو کہیے کیا پھر تم ڈرتے نہیں؟ پوچھئے (ان سے) کس کے ہاتھ میں ہے حکومت ہر چیز کی اور وہ بچا لیتا ہے اور اس سے کوئی بچا نہیں سکتا' اگر تم جانتے ہو؟ اب

بتائیں گے اللہ ! کہیے تو پھر کہاں سے تم پر جادو آپڑا ہے؟''

مگر خدا تعالیٰ کی ان تمام صفاتِ توحید کو ماننے کے باوجود وہ کافر تھے جنہیں سرکارِ دو عالم ﷺ ایمان کی دعوت دے رہے تھے۔ آج بھی مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ توحید کی امانت سینوں میں لیے ہوئے شرک میں مبتلا ہیں اور بے خبر ہیں کہ کتنا بڑا جرم کر رہے ہیں۔

خدا تعالیٰ کی ذات و صفات اور صفات کے تقاضو میں کسی دوسرے کو شریک سمجھنا شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات مطلق' بے پایاں اور ذاتی ہیں۔ جمادات' نباتات' حیوانات' انسان' جن' فرشتے سب اس کی مخلوق اور اس کے سامنے عاجز اور بے بس ہیں۔ وہ قادر مطلق ہے۔ مخلوق کا ہر ہر فرد پیدائش سے لے کر وفات تک اس کا محتاج ہے جب کہ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ یعنی وہ بے نیاز ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان بے پایاں قدرتوں اور اختیار کو تسلیم کرنے کے بعد یہ کیسے ممکن ہے کہ مخلوق کے کسی فرد کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھا جائے' اس سے اولاد اور رزق کے لیے سوال کیا جائے' اسے داتا یا گنج بخش کہا جائے ! شرک کی یہی بیماری کفار مکہ کو تھی۔ جب ان سے پوچھا جاتا کہ تم ان دوسروں کو معبود کیوں پکارتے ہو تو ان کا جواب قرآن پاک میں اس طرح نقل ہوا ہے:

{مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى} (الزُّمَر:۳)

''ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے قرب کے درجہ تک پہنچا دیں''۔

آج کے مسلمان بھی{اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ} نماز کی ہر رکعت میں پڑھتے اور اقرار کرتے ہیں کہ ''ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں'' مگر ساتھ ہی نماز کے باہر یا اللہ مدد کے نعرے کے ساتھ یا علی مدد اور یا رسول اللہ مدد بھی پکارتے ہیں۔ یہی خدا تعالیٰ کو معبود حقیقی ماننے والے عبدالنبی' عبدالرسول اور عبد المصطفیٰ نام رکھ لیتے ہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ نے عبد کی نسبت اللہ کی طرف کرتے ہوئے عبداللہ اور عبدالرحمن نام پسند کیے ہیں' کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ يُّؤۡتِيَهُ اللّٰهُ الۡكِتٰبَ وَ الۡحُكۡمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوۡلَ لِلنَّاسِ كُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّىۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ} (آل عمران:۷۹)

''کسی انسان کا کام نہیں ہے کہ اللہ اس کو کتاب' حکمت اور نبوت عطا کرے' پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم میرے بندے ہو جاؤ اللہ کو چھوڑ کر۔''

پھر رسول پاک ﷺ جن کی سیرت ہی سراپا قرآن ہے 'وہ عبداللہ اور عبدالرحمن کی بجائے عبدالرسول اور عبدالنبی جیسے نام کیسے برداشت کر سکتے! چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ کسی صحابی نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ والہانہ محبت کے باوجود ایسے ناموں کو اختیار نہیں کیا۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ نبی ﷺ پر درود بھیجو' یعنی ان کے حق میں رحمت اور سلامتی کی دعا کرتے رہا کرو۔ نیز اپنے لیے اور اپنے فوت شدہ عزیزوں کے لیے استغفار کرتے رہا کرو' مگر یہاں زندہ اور اہل قبور دونوں سے استمداد کی جارہی ہے حالانکہ وہ استغفار کے مستحق ہیں' اور زندوں کا حق ہے کہ وہ فوت شدہ مسلمانوں کی بخشش کی دعا کرتے رہیں۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ خدا تعالیٰ کی تمام صفات مطلق ہیں اور کوئی مطلق صفت اس کی مخلوق میں نہ ہے نہ تسلیم کی جائے گی' مگر اس کے باوجود مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد حاضر و ناظر' عالم ماکان ومایکون اور عالم الغیب کی صفات انبیاء کی طرف منسوب کرتی ہے' حالانکہ یہ صفات بلا استثناء صفاتِ باری تعالیٰ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انبیاء نے غیب کی خبریں دی ہیں' آخرت میں پیش آنے والی باتیں بتائی ہیں' مستقبل میں ہونے والے واقعات کی اطلاعات دی ہیں' مگر یہ ساری خبریں اس خبیر نے ان کو بتائیں جو عالم الغیب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی بھر کسی پیغمبر نے عالم ماکان ومایکون اور حاضر و ناظر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ قرآن کریم میں آتا ہے:

{قُلۡ لَّاۤ اَمۡلِكُ لِنَفۡسِىۡ نَفۡعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَ لَوۡ كُنۡتُ اَعۡلَمُ الۡغَيۡبَ لَاسۡتَكۡثَرۡتُ مِنَ الۡخَيۡرِ ۚۖ وَ مَا مَسَّنِىَ السُّوۡٓءُ ؕ اِنۡ اَنَا اِلَّا نَذِيۡرٌ وَّ بَشِيۡرٌ لِّقَوۡمٍ يُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿۱۸۸﴾} (الاعراف)

''(اے محمدؐ ان سے) کہو: میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا مگر اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے (وہ ہوتا ہے) اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے (اپنے لیے) حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ میں تو محض ایک خبردار کرنے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں ان لوگوں کے لیے جو میری بات مانیں۔''

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث کی ان ساری تصریحات کے باوجود مسلمان شرکیہ افعال کیوں اپناتے ہیں' جبکہ وہ توحید کی اہمیت اور شرک کی ہلاکت خیزی سے پوری طرح آگاہ ہیں؟ جواب یہ ہے کہ ایسے لوگ

اپنے سب سے بڑے دشمن کے حملوں سے بے خبر ہیں اور وہ دشمن شیطان ہے ' جس کا مشن اولاد آدم کو جنت سے محروم کر کے دوزخ کا مستحق ٹھہرانا ہے۔ چونکہ شرک ناقابل بخشش گناہ ہے اس لیے اس کی ہمہ وقت یہ کوشش ہے کہ نیک عمل کرنے والے مسلمانوں کو شرک کا خوگر بنا دے۔ وہ بڑا دھوکے باز ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

{وَ لَا یَغُرَّنَّکُمۡ بِاللّٰہِ الۡغَرُوۡرُ ﴿۳۳﴾} (لقمٰن)

''اور نہ دھوکہ دے تم کو اللہ کے نام سے وہ بڑا دغاباز (یعنی ابلیس)۔''

وہ شرک کے نام سے شرک نہیں کرواتا' بلکہ وہ شرک کی تباہ کن گولی پر نصح و خیر خواہی کے دھوکے کا غلاف چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ اور نادان انسان شرک میں ملوث ہو کر بھی اسی زعم میں رہتا ہے کہ وہ مؤمن اور مسلم ہے اور جنت اور بخشش کا مستحق ہے۔ حالانکہ اوپر دی گئی قرآنی تصریحات اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ شرک ناقابل بخشش گناہ ہے۔ شیطان تو اولاد آدم کا بدترین دشمن ہے' وہ تو مسلمانوں کو شرک کی تعلیم دے گا ہی' مگر مسلمان بھی تو سوچیں کہ جو کام آج وہ کر رہے ہیں کیا وہ کام قرون اولیٰ میں بھی ہوتے تھے؟ کیا ان کاموں میں شرک یا شرک کا شبہ تو نہیں ہے؟ پس شرک کے شبہ والے کام بھی چھوڑ دینے چاہئیں' مبادا شبہ صحیح ہو اور بات ارتکابِ شرک تک پہنچ جائے اور کامیابی اور فلاح خسرانِ ابدی میں بدل جائے۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلاَّ الْبَلَاغ

اسلام اور شخصیت پرستی

شخصیت پرستی انسانی کمزوریوں میں سے ایک کمزوری ہے ۔ اسی کی انتہائی صورت بت پرستی ہے۔ شخصیت پرستی خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔ عجلت پسندی' سہل انگاری اور حصول مقصد کے لیے ہر حربہ اختیار کر لینا بھی انسانی کمزوریاں ہیں' جن کو توازن اور اعتدال پر رکھنا بڑے عزم کی بات ہے۔ اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ دنیا میں مقصد براری کے لیے صرف وہی وسائل اختیار کیے جائیں جو جائز اور مستحسن ہوں۔ غلط وسائل اگرچہ حصولِ مقصد کے لیے کتنے ہی مناسب نظر آئیں اختیار نہ کیے جائیں۔ اصل میں اسی فرق و امتیاز کو پیش نظر رکھ کر عمل کرنا مطلوب ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے:

{خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَ الۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَکُمۡ اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ} (الملک)

''اللہ نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ کون تم میں سے اچھا عمل کرتا ہے۔''

اگرچہ ایمان بالآخرت بنیادی اسلامی عقائد میں سے ہے مگر دنیا کا عیش و آرام اور نقد سہولتیں اسے وقتی طور پر ذہن سے بھلا دیتی ہیں اور مسلمان ہونے کے باوجود انسان وہ کام کر گزرتا ہے جو آخرت کے اعتبار سے انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ پھر ابلیس تو ہر وقت برائی کو خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے۔ شیطان کو قرآن کریم میں ''غَرور'' بھی کہا گیا ہے جس کا معنی ہے دھوکے باز۔ انسان بہت جلدی شیطان کے دھوکے میں آکر غلط کام کر گزرتا ہے اور خدائی امتحان میں ناکام اور نامراد ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو یکساں صلاحیتوں کے ساتھ پیدا نہیں کیا۔ بعض لوگ اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں' پھر وہ مزید محنت و ریاضت کے ساتھ معاشرے میں ایک امتیازی مقام بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا اور

دائرہ اعتدال میں رہتے ہوئے ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا تو درست ہے مگر ایسے لوگوں کو دائرہ انسانیت سے ماوراء (super man) سمجھنا بہت بڑا دھوکہ ہے۔ اچھے ڈاکٹر' قابل انجینئر' لائق استاد' عالم باعمل' ماہر کاریگر' کامیاب ہوا باز وغیرہ بلاشبہ قابل عزت و تکریم بھی ہیں اور ان کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ بھی اٹھانا چاہیے۔ مگر ان کو انسانی کمزوریوں سے بالا سمجھ کر ان کے سامنے جھک جانا اور اپنی ذات کی تذلیل کرنا ہرگز روا نہیں۔ وہ تو خدائے واحد کی ایک اور صرف ایک ذات ہے جس کے سامنے خشوع و خضوع اور تذلل جائز ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے انبیائے کرام انسانیت کی عظمت اور بلندی کے انتہائی مقام پر فائز ہوتے ہیں اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے درجہ کمال تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود اسلام میں اس بات کی ہرگز گنجائش موجود نہیں کہ انہیں پرستش کا حق دار سمجھا جائے۔ قرآن کریم میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

{مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ...} (آل عمران:۷۹)

''کسی آدمی کا یہ حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب' حکمت اور نبوت عطا فرمائے' پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم میرے بندے بن جاؤ اللہ کو چھوڑ کر' بلکہ (وہ تو یہی کہے گا کہ) تم اللہ والے ہو جاؤ''۔

پھر اسلام نے ہمیں صرف نظریاتی تعلیم ہی نہیں دی بلکہ رسول پاک ﷺ کو اس تعلیم پر عمل کا نمونہ بنا کر بھی پیش کیا۔ قرآن میں ہے:

{لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ} (الاحزاب:۲۱)

''بے شک اللہ کے رسول ﷺ (کی زندگی) میں تمہارے لیے بہترین نمونہ موجود ہے''۔

رسول اللہ ﷺ اپنے وقت کے سب سے زیادہ قدر و منزلت کے حامل انسان تھے۔ آپؐ عظمت کے

انتہائی مقام پر فائز تھے۔ آپؐ خدا کے محبوب اور انسانوں کے ہادی تھے۔ اس کے باوجود آپؐ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اپنے سامنے جھکنے یا بچھنے کی

اجازت نہیں دی۔ اس بات کو زیادہ واضح کرنے کے لیے حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعینمیں سے کسی نے آپؐ سے عرض کیا کہ ہمارا دل چاہتا ہے کہ آپؐ کو سجدہ کریں مگر آپؐ نے پوری شدت کے ساتھ وضاحت کر دی کہ ہرگز نہیں ' سجدہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ جب رسول پاک ﷺ نے اپنی پرستش کی اجازت نہیں دی تو انسانوں میں آپؐ سے بڑا کون ہے جس کی پرستش کی جائے۔ پس پرستش کے لائق تو فقط وہی ایک ہے جو کائنات کا خالق و مالک ہے' حی و قیوم ہے' جس کو بقا ہے فنا نہیں' جو ہر طرح کی ادنیٰ سے ادنیٰ کمزوری(weakness) سے منزہ و مبرا ہے۔ بلکہ آپؐ نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ پرستش مَیں بھی صرف اسی خدائے واحد کی کرتا ہوں اور آپؐ' بھی صرف اسی کی پرستش کریں۔ آپؐ کا اُسوۂ حسنہ اس ضمن میں روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ آپؐ اللہ کی عبادت میں دن رات لگے رہتے تھے' آپؐ کے دن کے عمل بھی عبادت تھے اور رات کا قیام و سجدہ بھی عبادت تھا۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا رسول اللہ ﷺ اللہ کے محبوب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو معراج سے نواز ااور قیامت کے روز مقامِ محمود پر فائز کرے گا مگر اس کے باوجود آپؐ نے اپنے کسی عقیدت مند یا رشتہ دار کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ عمل سے فارغ رہے اور رسول کی نرمی' محبت یا رسول سے خونی رشتہ ہی کو اپنی نجات کے لیے کافی سمجھے۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے قریشیو! اپنی خبر لو۔ میں تم کو خدا سے نہیں بچا سکتا۔ اے عبدِ مناف! میں تم کو خدا سے نہیں بچا سکتا۔ اے عباس بن عبدالمطلب! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا۔ اے صفیہ رسولِ خدا کی پھوپھی! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا۔ اے محمد کی بیٹی فاطمہ! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا''۔ ایک بار حضرت فاطمہؓ کے گلے میں سونے کا ہار دیکھا تو فرمایا کہ تم کو برا نہ معلوم ہو گا جب لوگ کہیں گے کہ پیغمبر کی بیٹی کے گلے میں آگ کا ہار ہے؟

یہاں قارئین کی توجہ مسئلہ شفاعت کی طرف مبذول ہو گی۔ تو سمجھ لینا چاہیے کہ بلاشبہ رسول پاکؐ کی شفاعت اُمت کے گناہگاروں کے بارے میں حق ہے مگر وہ ایک

اعزاز ہے جو رسول اکرم ﷺ کو دیا جائے گا اور آپؐ صرف ان لوگوں کے حق میں شفاعت کریں گے جن کے لیے اللہ تعالیٰ اجازت دے گا اور جن کی بخشش کرنا چاہے گا۔ آج کسی فردِ بشر کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے وہ معلوم کر سکے کہ اس کے بارے میں رسول پاکؐ کو شفاعت کا اِذن دیا جائے گا۔ شفاعت کے بارے میں یہی

نقطۂ نظر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا تھا۔ اسی لیے وہ لوگ ہمہ وقت نیک اعمال میں منہمک رہے اور نظریۂ شفاعت نے ان کے اندر کسی بھی درجے میں بے عملی اور کوتاہی پیدا نہیں کی' ورنہ رسول پاکؐ کے ہمہ وقت ساتھی ہونے کے ناطے وہ آپؐ 'کی شفاعت کے اوّلین امیدوار ہونے کی بجائے اُسوۂ حسنہ کی پیروی میں اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالتے اور مشقت اور تکلیف کے بجائے آرام و راحت کی زندگی بسر کرتے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبریں پختہ بنانے سے منع فرمایا۔ اس میں بھی اسی بات کی پیش بندی کی گئی ہے کہ نیک اور صالح لوگوں کی قبریں اگر باقی رہیں گی تو شخصیت پرستی کے جذبے کے تحت لوگ ان قبروں کے ساتھ وابستگی رکھیں گے اور طرح طرح کے خرافات میں لگ جائیں گے۔ اسی طرح کسی خاص قبر کی زیارت کے لیے سفر کرنا آپؐ کے اُسوۂ حسنہ میں نظر نہیں آتا۔ خود عرب کے اندر شہر جدہ میں اماں حوا کی قبر بتائی جاتی ہے مگر آپؐ کا جدہ کی طرف سفر بغرضِ زیارت ثابت نہیں ہے۔ آپؐ کی زندگی میں آپ کے بیٹے فوت ہوئے 'بیٹیاں فوت ہوئیں' دیگر رشتہ دار اور دوست فوت ہوئے مگر آپؐ نے کسی کی قبر کو پختہ نہیں کیا اور نہ باقی رکھنے کی ہدایت کی۔ ہاں قبرستان میں جانا ' اہلِ قبور کی مغفرت کے لیے دعا کرنا اور اپنی موت کو یاد کرنے کا عمل نہ صرف آپؐ سے ثابت ہے بلکہ اس کا آپؐ نے حکم دیا ہے۔

شخصیت پرستی انسان کو فریب نفس میں مبتلا کر کے شرک کی نجاست سے آلودہ کر دیتی ہے جبکہ شخصیت پرستی سے کامل اجتناب نہ صرف توحید پر پختہ یقین ہے اور اُسوۂ حسنہ کی پیروی میں مستعدی پیدا کرتا ہے' بلکہ اُمت کے اندر افتراق و انتشار اور فرقہ پرستی کو ختم کرنے کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے۔ فرقوں کی بنیاد عموماً مختلف نامور اشخاص کے ساتھ حد

درجہ وابستگی پر قائم ہو گئی ہے۔جب اُمت کے تمام افرادِ اُمت کے نیک اور صالح افراد کے ساتھ یکساں وابستگی رکھیں' ان کی تحقیقات اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں' مگر رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی کو مطاع نہ سمجھیں' یعنی واجب الاطاعت ہستی بلا اختلاف رسول اللہ ﷺ کی ہی تسلیم کریں تو جھگڑے ختم اور فرقے بھی ختم۔ اور یہی حکم اللہ تعالیٰ کا ہے:

{فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوۡلِ} (النساء:۵۹)

''پس اگر کسی معاملے میں تمہارے درمیان جھگڑا پیدا ہوجائے تو اس کو اللہ اور (اس کے) رسول کی طرف لوٹا دو''۔

یعنی قرآن حکیم اور اُسوۂ حسنہ سے اس کا حل تلاش کرو۔ پس یہی دو چیزیں اتحاد و اتفاقِ اُمت کی بنیاد ہیں۔ قولِ رسولؐ اور آیت قرآن کے مقابلے میں کسی دوسرے شخص کی تحقیق کو اہم سمجھنا نہ صرف نادانی' جہالت اور گمراہی

ہے بلکہ اُمت کے اندر انتشار و افتراق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کا مشہور قول ہے کہ رسول پاکؐ کے فرمان کے مقابلے میں میری بات کو ترک کر دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ خود امام صاحب تلقین کر رہے ہیں کہ میری تحقیقات سے فائدہ تو اٹھاؤ مگر آنکھیں بند کر کے نہیں، کیونکہ قولِ فیصل میری بات نہیں بلکہ فرمانِ رسول ﷺ ہے۔ قریب قریب یہی بات اُمت کے صلحاء نے بھی کہی ہے۔ کسی نے اپنی بات کو اس انداز میں پیش نہیں کیا کہ اسے حرف آخر سمجھ کر قبول کیا جائے۔

اگر آج ہم صلحائے اُمت میں سے کسی ایک دو کا انتخاب نہ کریں بلکہ سب لوگوں کی تحقیق سے فائدہ اٹھائیں، جس بزرگ کے ساتھ کسی شخص کو زیادہ نسبت ہو جائے وہ دوسرے لوگوں کو اس بزرگ کے ساتھ ویسی ہی نسبت رکھنے پر مجبور نہ کریں بلکہ ان کی دوسرے بزرگوں کے ساتھ عقیدت اور محبت کو برداشت کریں تو مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کی طرف مثبت پیش رفت ہو سکتی ہے۔ اسی طرح بزرگوں کی قبروں کے ساتھ اگر وہی معاملہ کیا جائے جو سنت مطہرہ سے ثابت ہے تو قبر پرستی کی جڑ کٹ جاتی ہے

اور یہی ہمارے لیے راہِ صواب ہے۔ آپؐ نے اپنی آخری بیماری کے دوران فرمایا کہ ''(لوگو! تم میری قبر کو صنم نہ بنانا) یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا تھا''۔ (رواہ البخاری)

پس آج مسلمانوں کو چاہیے کہ شخصیت پرستی اور قبر پرستی کو چھوڑ کر اُسوۂ حسنہ کو دل و جان سے فیصلہ کن تسلیم کریں اور اس کے بدلے میں اتفاق و اتحاد کی نعمت سے بھی حظ اٹھائیں اور اپنی عاقبت بھی سنوار لیں۔

مسئلہ شفاعت

مسئلۂ شفاعت اُن مسائل میں سے ہے جن کی وضاحت اگرچہ قرآن پاک میں موجود ہے لیکن عام طور پر اُن کی توجیہ غیر معقول انداز میں کی جاتی ہے۔ درحقیقت یہاں ٹھوکر صرف اُن افراد نے کھائی ہے جنہوں نے

شفاعت کو عام مشاہدے میں آنے والی دُنیوی سفارش ہی کی طرح سمجھ لیا ہے جس میں ایک مقتدر آدمی کسی مجرم کی سفارش کرتا ہے اور اسے سزا سے بچا لیتا ہے اور اس طرح بااثر اور مقتدر لوگوں کے ساتھ تعلقات رکھنے والے لوگ قانون کی گرفت سے بے خوف ہو کر جرائم کرتے ہیں۔ اسی قسم کی غلط فہمی یہود کے ایک گروہ کو ہوئی تھی جو {نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰہِ وَ اَحِبَّآؤُہٗ...}کا دعویٰ کرتے تھے اور اسی دعویٰ کو اپنی نجات کے لیے کافی سمجھتے تھے۔اس مغضوب طبقے کے افراد کی طرح کچھ مسلمانوں نے بھی بس کلمۂ طیبہ کے اقرار باللسان کو نجات کے لیے کافی خیال کر کے فرار کی راہ اختیار کر لی ہے۔ حالانکہ قرآن پاک کلمہ گو مسلمانوں سے اسلامی احکام پورے کے پورے عملاً اختیار کرنے کا تقاضا کرتا ہے بفحوائے الفاظِ قرآنی:

{ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّۃً} (البقرۃ)

''اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔''

اس طرح قرآن پاک میں ایمان لانے والوں کو بھی ایمان لانے کو کہا گیا ہے' جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ زبان سے توحید و رسالت کا اقرار کرنے والو! قلب کی گہرائیوں میں کلمۂ طیبہ پر یقین پختہ کرو۔ جس کے نتیجہ میں تمہارے اعمال تقویٰ کی غربال سے چھن کر نکلیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ کلمۂ طیبہ پڑھنے والوں کو طرح طرح کی آزمائشوں سے گزارے بغیر نہ چھوڑا جائے گا یعنی کلمہ پڑھ کر جس عقیدۂ توحید و رسالت کا انہوں نے اقرار کیا ہے ' اس کی پختگی کا اندازہ مختلف امتحانات میں سے گزار کر کیا جائے گا۔ گویا کلمہ

طیبہ کا زبانی اقرار انسان کو قانونی طور پر مسلمان تو بنا دیتا ہے مگر نجات کے لیے کفایت نہیں کرتا۔ ارشادِ خداوندی ہے :

{اَحَسِبَ النَّاسُ اَنۡ یُّتۡرَکُوۡۤا اَنۡ یَّقُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا وَ ہُمۡ لَا یُفۡتَنُوۡنَ ﴿۲﴾ وَ لَقَدۡ فَتَنَّا الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِہِمۡ فَلَیَعۡلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ صَدَقُوۡا وَ لَیَعۡلَمَنَّ الۡکٰذِبِیۡنَ ﴿۳﴾}(العنکبوت)

''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا ۔ حالانکہ ہم اُن سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور ضرور معلوم کرنا ہے کہ جھوٹے کون ہیں۔''

اسی مضمون کو قرآن پاک میں کئی جگہ مختلف پیرائوں میں بیان کیا گیا ہے جس سے بات پوری طرح واضح ہو گئی ہے مثلاً:

{اَمۡ حَسِبۡتُمۡ اَنۡ تَدۡخُلُوا الۡجَنَّۃَ وَ لَمَّا یَعۡلَمِ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ جٰہَدُوۡا مِنۡکُمۡ وَ یَعۡلَمَ الصّٰبِرِیۡنَ ﴿۱۴۲﴾}(آل عمران)

''کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے ' حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم

میں سے جہاد میں جان لڑانے والے اور پامردی دکھانے والے کون ہیں؟''۔
معلوم ہوا کہ ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہی رہا ہے کہ وہ دعوائے ایمان کرنے والوں کی آزمائش کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ سنت اللہ تبدیل نہیں ہوا کرتی۔ اس دور میں دعوائے ایمان کرنے والوں کو آزمائش میں ڈال کر ان کے دعویٰ کی عملی صداقت کیوں نہ دیکھی جائے گی اور اُن کے زبانی اقرار کو سنت اللہ کے خلاف کیسے قبول کر لیا جائے گا جبکہ تکالیف و مصائب کی بھٹیوں سے خود رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ کو بھی گزارے بغیر نہ چھوڑا گیا۔ حکیم الامت علامہ اقبال مرحوم نے آزمائش کے خوف کا اظہار اس طرح کیا ہے: ؎

چوں می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را!

اب وہ حدیث ملاحظہ ہو جس میں کلمہ گو کو جنت کی بشارت ہے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ حضور ﷺ سے نقل کرتے ہیں:

((مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُخْلِصًا دَخَلَ الْجَنَّۃَ قِیْلَ وَمَا اِخْلَاصُھَا قَالَ اَنْ تَحْجِزَہٗ عَنْ مَحَارِمِ اللّٰہِ)) (طبرانی فی الاوسط الکبیر)

''جو شخص اخلاص کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہے وہ جنت میں داخل ہو گا۔ کسی نے پوچھا کہ کلمے کا اخلاص کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''یہ کہ وہ اسے حرام کاموں سے روک دے!''۔

اس حدیث سے یہ سمجھنا کہ کلمۂ طیبہ زبان سے پڑھ لینا حصول جنت کے لیے کافی ہے' پرلے درجے کی نافہمی ہے۔ قولِ رسولؐ تو سورۃ العنکبوت کی محولہ بالا آیت کی سرتاسر تائید کر رہا ہے کہ نافع کلمہ صرف وہی ہے جو قائل کی زندگی میں انقلاب پیدا کر کے اسے متقی (پرہیزگار) بنا دے' یعنی وہ حرام کاموں سے پرہیز کرنے لگے۔

شفاعت کا مسئلہ بھی اسی قبیل سے ہے' یوں سمجھئے کہ کچھ اعمال ایسے ہیں کہ جو کسی مسلمان کی شفاعت کا تقاضا کریں گے اور اس طرح اس کی شفاعت کی جائے گی۔ مگر اس بات کو تو اللہ ہی جانتا ہے کہ شفاعت کا اعزاز کس کو ملے گا اور شفاعت کن کے حق میں نافع ہو گی۔ اگر ہر مدعیٔ اسلام کے حق میں شفاعت کو نافع سمجھ لیا جائے تو :

{وَ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ} (الانعام:۱۶۴)

''کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا''۔

اور:

{اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ﴿۳۸﴾ وَ اَنْ لَّیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ﴿۳۹﴾ وَ اَنَّ سَعْیَہٗ سَوْفَ یُرٰی ﴿۴۰﴾ ثُمَّ یُجْزٰىہُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰی ﴿۴۱﴾}

''کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا' اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے کوشش لی۔ اور یہ کہ اس کی سعی و کوشش عنقریب دیکھی جائے گی یا اس کو دکھا دی جائے گی ۔ پھر بدلہ دیا جائے گا اس کو پورا بدلہ''۔

اور:

{لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ} (البقرة:٢٨٦)

''ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اُس کا پھل اُس کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے اُس کا وبال اسی پر ہے۔''

کے قبیل کی آیات کی نہ صرف تکذیب ہوتی ہے بلکہ اس بات سے عدلِ خداوندی پر بھی حرف آتا ہے۔ جناب رسالت مآب ﷺ کو خود وحیٔ الٰہی کے ذریعے حکم ملا کہ:

{وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ﴿٢١٤﴾} (الشعراء)

''اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ۔''

اس پر جناب رسول کریم ﷺ نے اپنے دادا کی اولاد کو جمع کیا اور مخاطب کر کے فرمایا:

''اے بنی عبدالمطلب' اے عباس' اے صفیہ رسول اللہ کی پھوپھی' اے فاطمہ محمدؐ کی بیٹی' تم لوگ آگ سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کر لو۔ مَیں خدا کی پکڑ سے تم کو نہیں بچا سکتا البتہ میرے مال میں سے تم لوگ جو کچھ چاہو مانگ سکتے ہو۔''

قرآن پاک کی رو سے کفار کو تو کسی قسم کی شفاعت بھی نفع نہ دے گی۔ سورۃ الشعراء میں ذکر ہے کہ جب کفار دوزخ میں جھونک دیے جائیں گے تو وہ کہیں گے:

{وَمَا أَضَلَّنَا إِلَّا الْمُجْرِمُونَ ﴿٩٩﴾ فَمَا لَنَا مِن شَافِعِينَ ﴿١٠٠﴾ وَلَا صَدِيقٍ حَمِيمٍ ﴿١٠١﴾} (الشعراء)

''اور وہ مجرم لوگ ہی تھے جنہوں نے ہم کو اس گمراہی میں ڈالا اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے اور نہ کوئی جگری دوست۔''

اسی طرح سورۃ المدثر میں ذکر ہے کہ کافر کو کسی کی شفاعت نفع نہ دے گی:

{فَمَا تَنفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ ﴿٤٨﴾} ''پس سفارش کرنے والوں کی سفارش اُن کو فائدہ نہ دے گی۔''

رہے ایمان دار لوگ تو اُن کے حق میں سفارش قبول کی جائے گی لیکن وہ سفارش دنیا کی سفارش پر قیاس نہ کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور جس کا جی چاہے اور جس کے حق میں جی چاہے سفارش کر دے۔ ایسی بے سروپا سفارش احکم الحاکمین کے حضور تو گمان بھی نہیں کی جا سکتی۔ قرآن شاہد ہے کہ:

{مَنۡ يَّشۡفَعۡ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنۡ لَّهٗ نَصِيۡبٌ مِّنۡهَا‌ ۚ وَمَنۡ يَّشۡفَعۡ شَفَاعَةً

سَيِّئَةً يَّكُنۡ لَّهٗ كِفۡلٌ مِّنۡهَا‌ ؕ} (النساء:۵۸)

''جو بھلائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور جو برائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا''۔

اب ایسا کون ہے جو خدا کی گرفت سے بے نیاز ہو کر مغضوب لوگوں کی سفارش کر کے اپنے آپ کو خدا کے غضب کا نشانہ بنالے۔ اسی لیے قرآن حکیم کی تعلیم اس ضمن میں یہ ہے کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں کر سکے گا بلکہ سفارش کرنے والے کو بھی بارگاہِ خداوندی سے جس کے حق میں سفارش کی اجازت دی جائے گی صرف اسی کے حق میں وہ سفارش کر سکے گا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ سفارش کا مطلق حق صرف رب العالمین ہی کو ہے۔ سورۃ الزمر میں اسی حقیقت کا بیان ہے:

{قُلۡ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيۡعًا‌ ؕ}

''کہہ دیجیے سفارش تو پوری کی پوری اللہ کے اختیار میں ہے۔''

قرآن کی رو سے شفاعت تو ایک قسم کا اعزاز ہے جسے ربّ العالمین اپنے بعض بزرگوں کو عنایت فرمائے گا لیکن یہ اعزاز اُسی صورت میں ہے جبکہ شافع کی شفاعت کو شرفِ قبولیت بخشا جائے مگر خدا کے بندوں میں سے کوئی عالم الغیب تو ہے نہیں جو کسی انسان کی زندگی کے تمام ظاہری و باطنی احوال و اعمال سے واقف ہو۔ اور اس واقفیت کی بنا پر جان لے کہ فلاں کے حق میں وہ سفارش کرے تو وہ یقینا قبول ہو گی۔ فلہٰذا عالم الغیب ہی اس بات کو جانتا ہے کہ کون شخص شفاعت کے لائق ہے۔ چنانچہ اُسی کے حق میں اللہ تعالیٰ اپنے اس معزز بندے کو شفاعت کا حق دے گا اور پھر اُس کی شفاعت کو شرفِ قبولیت بخش کر بھرے اجلاس میں اس عبدِ شافع کے حق میں اپنی شانِ شکوری کا اظہار فرما کر اسے سرفراز فرمائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں شفاعت کا اثبات کیا گیا ہے وہاں عموماً عالم الغیب کا اذن ضروری قرار دیا گیا۔ سورۃ البقرۃ میں ہے:

{ مَنۡ ذَا الَّذِىۡ يَشۡفَعُ عِنۡدَهٗۤ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ‌ ؕ يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ‌ ۚ}(البقرۃ:۲۵۵)

''کون ہے جو اُس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے۔''

پھر سورۂ طٰہٰ میں فرمایا:

{یَوۡمَئِذٍ لَّا تَنۡفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَہُ الرَّحۡمٰنُ وَ رَضِیَ لَہٗ قَوۡلًا ﴿۱۰۹﴾ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ مَا خَلۡفَہُمۡ وَ لَا یُحِیۡطُوۡنَ بِہٖ عِلۡمًا ﴿۱۱۰﴾}

''اس روز شفاعت کارگر نہ ہوگی اِلّا یہ کہ کسی کو رحمن اس کی اجازت دے اور اس کی بات سننا پسند کرے۔ وہ لوگوں کا اگلا پچھلا سب حال جانتا ہے اور دوسروں کو اس کا پورا علم نہیں''۔

پس شفاعت کو مشروط باذن اللہ کرنا دراصل شافعین کو اہانت سے محفوظ رکھنے اور اُن کی تکریم کو حتمی بنانے کے لیے ہے۔ کیونکہ جس طرح یہ بات شافع کے لیے حد درجہ اکرام کا باعث ہے کہ اُسے بارگاہِ خداوندی سے شفاعت کی اجازت ملے اور پھر اس کی شفاعت شرفِ قبولیت پائے۔ اسی طرح اگر کسی کی شفاعت میدانِ حشر میں ردّ کر دی جائے تو یہ اس کے لیے رسوائی کا باعث ہوگی۔ اس لیے شفاعت کو باذن اللہ مشروط کر کے ربّ شکور نے اپنے برگزیدہ اور نیک بندوں کے لیے میدانِ حشر میں رسوائی کے امکان ہی کو ختم کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں جہاں جہاں بھی شفاعت کا ذکر ہے وہاں باذن اللہ کی شرط بھی لگائی گئی ہے۔ سورۃ البقرۃ اور سورۂ طٰہٰ کی مذکورہ بالا آیات کے علاوہ سورۃ الانبیاء کی آیت 28 ملاحظہ ہو:

{وَ لَا یَشۡفَعُوۡنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰی وَ ہُمۡ مِّنۡ خَشۡیَتِہٖ مُشۡفِقُوۡنَ ﴿۲۸﴾}

''اور وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اُس شخص کے جس کے حق میں سفارش سننے پر رحمن راضی ہو اور وہ اس کے خوف سے ڈرے ڈرے رہتے ہیں''۔

اس کے علاوہ سورۃ النباء میں روزِ محشر کا نقشہ اور شفاعت کا ذکر اس طرح ہے:

{یَوۡمَ یَقُوۡمُ الرُّوۡحُ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ صَفًّا ؕ لَّا یَتَکَلَّمُوۡنَ اِلَّا مَنۡ اَذِنَ لَہُ الرَّحۡمٰنُ وَ قَالَ صَوَابًا ﴿۳۸﴾}

''وہ دن جبکہ روح اور ملائکہ سب صف بستہ کھڑے ہوں گے، ذرا بات نہ کریں گے۔ صرف وہی بول سکے گا جسے رحمن اجازت دے اور جو ٹھیک ٹھیک بات کہے۔''

فرشتے بھی بارگاہِ خداوندی میں بایں ہمہ تقرب بدوں اجازت لب کشائی نہ کر سکیں گے:

{وَ کَمۡ مِّنۡ مَّلَکٍ فِی السَّمٰوٰتِ لَا تُغۡنِیۡ شَفَاعَتُہُمۡ شَیۡئًا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ اَنۡ یَّاۡذَنَ اللّٰہُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ یَرۡضٰی ﴿۲۶﴾} (النجم)

''کتنے ہی فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتی بجز اس کے کہ اللہ سے اجازت ملنے کے بعد کی جائے اور ایسے شخص کے حق میں کی جائے جس کے لیے وہ سفارش سننا چاہے اور پسند

کرے۔‘‘

نتیجہ اس ساری گفتگو کا یہ نکلا کہ اُصولی طور پر قیامت کا دن دوستیاں نبھانے یا سفارشیں کرنے کا نہیں ہے جیسا کہ خود قرآن کہتا ہے :{لَا خُلَّۃٌ وَّ لَا شَفَاعَۃٌ} (البقرۃ:۲۵۴) بلکہ عدل و انصاف کا دن ہے۔ اُسی عدل کا تقاضا ہے کہ احکم الحاکمین کی بارگاہ میں غیر معمولی فرماں بردار اور برگزیدہ بندوں کو خصوصی اکرام و اعزاز سے نوازا جائے۔ چنانچہ انبیاء و رسل اور نیک لوگوں کو بعض دوسرے افراد کے حق میں سفارش کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے گی اور اسے شرفِ قبولیت بخشا جائے گا۔ کیونکہ عالم الغیب اور شفاعت کا مطلق مختار اللہ تعالیٰ ہے اس لیے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس کے حق میں سفارش کرنے کی کسی نبی یا ولی کو اجازت ملے گی۔ لہٰذا شفاعت پر بھروسہ کر کے نیک اعمال اور فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی قرآن کی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آیاتِ شفاعت پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان کو زندگی میں خدا و رسول کے احکامات کی ہر قدم پر پابندی کر کے اپنے آپ کو اس کا اہل بنانے کی کوشش کرنا چاہیے کہ ربّ العزت کے ہاں سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی شفاعت کا اذن مل جائے اور اس طرح اس کی لغزشوں اور کوتاہیوں پر ستار العیوب پردہ ڈال دے۔ گویا مسئلہ شفاعت ان قرانی تعلیمات کا اہم جزو ہے جن میں جدوجہد اور پرہیزگاری پر زور دیا گیا ہے۔ مکافاتِ احوال سے غفلت کا جواز کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ ۔

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ

سورۃ المدثر میں مذکور ہے کہ حساب کتاب کے بعد جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں بھیج دیے جائیں گے تو جنتی دوزخ میں پڑے لوگوں سے پوچھیں گے کہ تمہیں کون سی چیز دوزخ میں لے گئی ؟ تو وہ جواب میں چار چیزوں کا ذکر کریں گے اور کہیں گے کہ اوّل ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔ دوم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے

تھے۔ سوم فضول قسم کی محفلوں میں بیٹھا کرتے تھے۔ چہارم فیصلے کے دن کا انکار کرتے تھے۔ اسی حال میں ہماری مہلتِ عمر ختم ہو گئی یعنی موت آگئی۔ گویا وہ لوگ اپنی آپ بیتی سناتے ہوئے اقرار کر رہے ہیں کہ دیگر جرائم و آثام کی نسبت یہ چاروں کام دوزخ کا مستحق بنانے کی خصوصی تاثیر رکھتے ہیں۔ اب قرآن تو آیات پر غور و فکر اور تذکر و تدبر کی دعوت دیتا ہے۔ جب کوئی قاری ان آیات پر غور کرے گا تو یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ دوزخیوں اور جنتیوں کے مابین یہ گفتگو اُمت مسلمہ کے افراد کو دو ٹوک انداز میں اسبابِ دخولِ جہنم کی نشاندہی کرتی ہے تاکہ قرآن پڑھنے والے دخولِ جہنم کے اسباب کو اچھی طرح جان لیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں ورنہ پیمانہ لبریز ہو جانے کے بعد خدا کے حضور اپنے گناہوں کا اقرار و اعتراف کچھ فائدہ نہ دے گا۔

ترکِ صلوٰۃ

جہنم میں لے جانے والی ان چار باتوں میں سے پہلی بات ترک صلوٰۃ ہے۔ نماز ارکان اسلام میں سے ایک رکن، حقوق اللہ میں سے ایک حق اور لا الٰہ الا اللہ کے اقرار کی مظہر ہے۔ فرمان نبویؐ کے مطابق جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والا گویا کفر کا ارتکاب کرتا ہے۔ یعنی نماز مؤمن اور کافر کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ نماز مسلمان کی شناخت ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔ آنحضرت ﷺ

نے نماز کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے۔ نماز قائم کرنے کا حکمِ خداوندی قرآن کریم میں متعدد مرتبہ آیا ہے جس سے اس کی اہمیت واضح ہے۔ پھر خود رسول پاکؐ کا طرزِ عمل ملاحظہ ہو کہ آپؐ نے پوری زندگی آخری سانس تک نماز پنجگانہ کی پابندی کی ہے بلکہ آپؐ کو نماز کے ساتھ اس قدر الفت تھی کہ راتوں کو نفل نمازوں میں اس قدر لمبا قیام کرتے کہ پائوں مبارک پر ورم آجاتا۔ نماز عبد اور معبود کے تعلق کو نمایاں کرتی ہے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ حالتِ سجدہ میں انسان اللہ تعالیٰ کے قریب ترین ہوتا ہے۔ غور کیجیے تارکِ صلوٰۃ معرفتِ حق تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟ وہ رسول پاک ﷺ کی محبوب عبادت کو چھوڑ کر خدا کا پیارا کیسے بن سکتا ہے؟ خالی زبانی دعوئوں اور خوشامدی جملوں سے نہ خدا کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے نبی ﷺ کو۔ سچ تو یہ ہے کہ مسلمان وہی ہے جس کی پسند وناپسند اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پسند وناپسند کے تابع ہو گی۔

آج دیکھئے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نماز کی اہمیت سے غافل ہے۔ اپنی اپنی مصروفیتوں میں نماز کو بھولے بیٹھے ہیں اور کچھ فرقہ پرست مولویوں کے طرزِ عمل کو آڑ بنا کر نماز اور مسجد سے بے تعلقی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ وہ مولویوں کو دین کا نمائندہ سمجھ بیٹھے ہیں حالانکہ یہ دھوکہ ہے۔ ہمارے لیے اُسوۂ حسنہ خود رسول پاک ﷺ ہیں، ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنا ہے اور بس! ایسے لوگ داڑھی رکھنے، نماز پڑھنے اور شلوار کو ٹخنوں سے اونچا رکھنے کو محض قدامت پسندی اور جنونیت سمجھتے ہوئے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ غفلت بڑی

خطرناک ہے۔ سورۃ المدثر کی زیر بحث آیات پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوزخی اہل ایمان میں سے ہوں گے، کیونکہ اگر کافر ہوتے تو مطلق کفر ہی کو دخولِ جہنم کا سبب بناتے۔ مولانا مودودیؒ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''... اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نماز کوئی شخص اس وقت پڑھ ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ ایمان نہ لایا ہو اس لیے نمازیوں میں سے ہونا آپ سے اور آپ ایمان لانے والوں میں سے ہونے کو مستلزم ہے لیکن نمازیوں میں نہ ہونے کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دے کر یہ بات واضح کر

دی گئی کہ ایمان لا کر بھی آدمی دوزخ سے نہیں بچ سکتا اگر وہ تارکِ نماز ہو''۔
(تفہیم القرآن، جلد ششم، ص ۱۵۴) پس مسلمان کا کسی بھی عذر سے تارکِ صلوٰۃ ہونا انتہائی خود فریبی ہے۔ ترکِ نماز تو دور کی بات ہے، نماز کو پورے اہتمام اور تکلف سے پڑھنے کی تلقین ہے۔ غفلت اور سستی کیساتھ ادا کردہ نماز پر بھی بڑے عذاب کی تنبیہہ کی گئی ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ خود بھی نماز پڑھیں اور اپنے گھر والوں کو بھی نماز پڑھنے کی تاکید کریں۔ دیکھئے قرآن پاک میں ہے:

{وَ اۡمُرۡ اَہۡلَکَ بِالصَّلٰوۃِ وَ اصۡطَبِرۡ عَلَیۡہَا} (طٰہٰ:۱۳۲)

''اور (اے نبیؐ) اپنے اہل کو نماز کا حکم دیجیے اور خود بھی اس پر جمے رہیے۔''

نماز کی اس قدر اہمیت اور تاکید کے باوجود اگر کوئی مسلمان تارکِ صلوٰۃ ہو تو یہ بات اسی طرح ناقابلِ فہم ہے جس طرح کسی مسلمان کا جہنم میں پھینکا جانا سمجھ میں نہیں آتا۔

مسکین کو کھانا نہ کھلانا

اہل دوزخ اپنا دوسرا بڑا جرم مسکین کو کھانا نہ کھلانا بتاتے ہیں۔ نماز کی طرح قرآن کریم میں مسکین کو کھانا کھلانے کی تاکید بھی کئی مرتبہ بیان ہوئی ہے۔ صاحبِ حیثیت لوگوں کا فرض ہے کہ وہ مفلس اور نادار لوگوں کا خیال رکھیں، ان کی ضروریات پوری کریں، ان کی تنگدستی دور کرنے کی کوشش کریں، بھوکوں کو کھانا کھلائیں۔ رزق کی کثرت و قلت اللہ کے اختیار میں ہے، وہ کچھ لوگوں کو کشادہ روزی دیتا ہے جبکہ کچھ دوسروں کا رزق تنگ ہوتا ہے۔ پس کشادہ روزی والے نعمتوں اور آسائشوں کی فراوانی پا کر احساسِ برتری میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور غریبوں اور مسکینوں کو قابل نفرت اور حقیر سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کی تعلیم کے مطابق امیر لوگوں کی روزی میں ناداروں کا حصہ بھی شامل ہوتا ہے۔ اسی لیے امیروں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مفلسوں اور غریبوں کو ان کا حق ادا کریں۔ اور اگر وہ یہ حق نہیں ادا کرتے تو گویا وہ حق تلفی کے گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ سورۃ الذاریات میں ہے:

{وَ فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ ﴿۱۹﴾}

''اور ان کے مالوں میں سوالی اور نادار کا حق ہے''۔

اسی طرح سورۃ المعارج میں ہے:

{وَ الَّذِیۡنَ فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ ﴿۲۵﴾}

''اور وہ لوگ جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا مقرر حق ہے۔''

یوں دولت مندوں پر واضح کر دیا کہ ان کے مالوں میں ضرورت مندوں کا حق شامل ہے جو انہیں ضرور ادا کرنا ہے۔ پھر سورۃ الماعون میں یومُ الدِّین کو جھٹلانے والے شخص کی نشانیاں بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ دوسروں کو مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔ گویا دولت مندوں کو اس بات کی تلقین کرنا بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے کشادہ رزق میں سے لازمی طور پر ناداروں کا حصہ ادا کریں۔ یہاں قابل غور بات یہ بھی ہے کہ سورۃ الماعون میں ''اطعام المسکین'' کی بجائے ''طعام المسکین'' یعنی ''مسکین کا کھانا'' مرکب اضافی کی صورت میں آیا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دولت مند مسکینوں کو ان کا کھانا لوٹائیں جو ان کے پاس بطور امانت رکھا گیا ہے۔

اگر ہم اپنی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اَسلاف میں نہ صرف ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کا جذبہ تھا بلکہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے تھے۔ سورۃ الحشر میں انصارِ مدینہ کے ایثار کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

{وَ یُؤۡثِرُوۡنَ عَلٰۤی اَنۡفُسِہِمۡ وَ لَوۡ کَانَ بِہِمۡ خَصَاصَۃٌ} (الحشر:۹)

''اور وہ دوسرے ضرورت مندوں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں اور اگرچہ وہ خود بھوکے ہوتے ہیں۔''

یعنی رسول پاک صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کے تربیت یافتہ افراد کا طرزِ عمل یہ تھا کہ وہ خود بھوکے رہ کر دوسروں کی بھوک مٹاتے تھے چہ جائیکہ اپنی ضروریات اور سہولتوں کی فراہمی میں اپنے اردگرد کے نادار اور غریب لوگوں کو نظر انداز کیا جائے۔

یہ گھاٹی عبور کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ نفس کا لالچ تو ہر انسان کو خود غرض بناتا ہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیۡ} (یوسف:۵۳)

''بیشک نفس تو پوری قوت کے ساتھ برائی پر آمادہ کرتا ہی ہے سوائے اس شخص کے جس پر میرے ربّ نے رحم کیا۔''

جب بھی انسان فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا ارادہ کرے شیطان اسے مال کے کم ہونے کے خدشے میں مبتلا کر کے اس کا ہاتھ روکتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{اَلشَّیۡطٰنُ یَعِدُکُمُ الۡفَقۡرَ} (البقرۃ:۲۶۸)

''شیطان تمہیں افلاس سے ڈراتا ہے۔''

ایسے موقع پر اہل اللہ ہی نفس کو کچلنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ اور جو اس میں کامیاب رہے بس وہی حقیقت میں کامیاب ہیں۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:

{وَ مَنۡ یُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۹﴾} (الحشر:۹)

''اور جو نفس کے لالچ سے بچا لیا گیا پس ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

ورنہ نفس کا حملہ تو آخری وقت تک جاری رہتا ہے۔ اگر انسان ضرورت مندوں پر مال خرچ کرنے کا ارادہ کر ہی لے تو نفس نمود و نمائش کی ترغیب دیتا ہے تاکہ یہ انفاق اکارت چلا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{کَالَّذِیۡ یُنۡفِقُ مَالَہٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَ الۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ} (البقرۃ:۲۶۴)

''مانند اس شخص کے جو اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کے دکھلاوے کے لیے اور نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ یوم آخر پر۔''

یا پھر بچا کھچا اور ناقص مال خرچ کرتا ہے جو قبول نہیں ہوتا:

{لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ۬ؕ} (آل عمران:۹۲)

''تم ہرگز نیکی کو نہیں پا سکتے یہاں تک کہ اس شے میں سے خرچ کرو جسے تم پسند کرتے ہو۔''

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول پاکؐ نے فرمایا:

''وہ شخص مجھ پر ایمان نہیں لایا جو خود تو پیٹ بھر کر سو جائے اور اس کے پہلو میں اس کا ہمسایہ بھوکا ہو اور اسے علم بھی ہو''۔

معلوم ہوا کہ بھوکے کو کھانا کھلانا انتہائی ضروری ہے۔ اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ ثروت مند لوگ غریبوں اور مسکینوں کی تضحیک و تحقیر کی بجائے ان کے ساتھ ہمدردی اور اعانت کا رویہ اپنائیں تاکہ وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر معاشرے کا عضوِ معطل نہ بنیں بلکہ برابری کے احساس کے ساتھ اپنی صلاحیتیں بروئے کار لا کر ملک و ملت کے لیے مفید ثابت ہو سکیں۔

فضول بحث و مشاغل میں اُلجھنا

لایعنی باتوں کے پیچھے پڑنا اور فضول مشاغل میں وقت صرف کرنا بھی دخولِ جہنم کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ اگر ہم سیرتِ نبویؐ کا مطالعہ کریں تو ہمیں اُسوۂ حسنہ میں ایک بھرپور عملی زندگی نظر آتی ہے جو سراسر جدوجہد اور سعی و جہاد سے پُر ہے۔ حیاتِ طیبہ کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا جسے بامقصد نہ گزارا گیا ہو۔

یہی اُسوۂ حسنہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنایا اور یہی صلحائے اُمت کا شعار تھا۔ اسلام میں تضیع اوقات کا کوئی تصور نہیں۔ کسی مسلمان کے پاس فالتو وقت نہیں ہوتا جس میں وہ کسی عبث کام میں الجھے۔ اہل دوزخ کہہ رہے ہیں:{وَ كُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآىٕضِيْنَ ﴿۴۵﴾} یعنی ''ہم مشغول رہتے تھے مشغول رہنے والوں کے ساتھ''۔ اور ''خوض'' وہ مشغلہ ہے جو نتیجہ خیز نہ ہو۔ گویا جس قسم کی بھی محفل دیکھی اسی میں شامل ہو گئے' یہ نہ سوچا کہ اس مشغولیت میں کوئی دینی یا دنیاوی منفعت بھی متوقع ہے یا نہیں۔

یہ مشغولیت اگرچہ معصیت کے تحت تو نہیں آتی' لیکن مسلمان کی زندگی کے لمحات بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طالب علم امتحان گاہ میں بیٹھا ہے۔ اسے محدود وقت دیا گیا ہے۔ اگر وہ طالب علم اپنے وقت سے بھرپور انداز میں استفادہ کرتا رہے اور پرچہ میں دیئے گئے سوالوں کے جوابات میں پوری طرح منہمک

رہتا ہے تو اس کا نتیجہ اچھا رہے گا۔ اس کے برعکس اگر طالب علم کمرۂ امتحان میں بیٹھ کر نہ تو دھیان سے پرچہ امتحان ہی پڑھے اور نہ ہی سنجیدگی کے ساتھ سوالات کے جوابات لکھے بلکہ اپنی جوابی کاپی پر الٹی سیدھی لکیریں لگانے میں وقت ختم کر دے تو ایسے طالب علم نے کارِ عبث کیا اور نتیجہ کے وقت اسے حسرت اور مایوسی کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ حدیث نبویؐ کے مطابق دنیا آخرت کی کھیتی ہے ۔ جو کسان بوائی کے موسم میں بیج کاشت کرنے کی بجائے ادھر ادھر کے کاموں میں مشغول رہا وہ کٹائی کے موسم میں لازماً محروم رہے گا۔

مسلمان کو تو زندگی گزارنے کا مکمل پروگرام دیا گیا ہے' جو الفاظ کی صورت میں قرآن پاک ہے اور عمل کی صورت میں رسول خدا کی زندگی ہے جو سراسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے تعبیر ہے۔ حقوق اللہ میں تمام عبادات اور حقوق العباد میں تمام معاشرتی ذمہ داریاں شامل ہیں۔ کون شخص ایسا ہو گا جو عبادت کا حق بھی ادا کر چکا اور معاشرتی ذمہ داریاں بھی پوری کر چکا اور اب لغویات کے لیے بھی اس کے پاس وقت بچ گیا ہے: ع ایں خیال است و محال است و جنوں۔

کھیل تماشے' ناچ گانے اور اسی طرح کی دوسری لغویات نفس کے لیے تو پرکشش ہیں' مگر کارِ عبث ہونے کی وجہ سے اسلام میں ان کی کوئی گنجائش نہیں۔ مسلمان کی زندگی میں وقت کاٹنے کا کوئی تصور نہیں کیونکہ اس کی زندگی میں کرنے کے بہت اہم کام موجود ہیں جن سے مطلق خیر برآمد ہوتی ہے۔ وہ اللہ کے ذکر میں اور قرآن سیکھنے سکھانے میں مصروف رہے گا۔ پھر روزی کمانے اور اہل خانہ کی تربیت اور نگہداشت کا فریضہ ادا کرے گا۔ ملک و قوم کی بہتری اور فلاح و بہبود کے کاموں میں شرکت کرے گا۔ اس کے پاس تاش کھیلنے اور لہو و لعب کے لیے وقت ہی کہاں ہو گا۔

جہالت اسلام کی ضد ہے' اس لیے کوئی مسلمان جاہل نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں صحت کی بحالی کی خاطر سیر و تفریح اور ورزش کا تو جواز ہے کیونکہ صحت خود بہت بڑی نعمت ہے۔ صحت ہو گی تو فرائض کی ادائیگی ہو سکے گی۔ اگر مسلمان کو سفر درپیش ہو تو وہ

''سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ'' کے حکم کے موافق چشمِ عبرت وا رکھے گا تاکہ قدرت کی نشانیاں دیکھے اور ایمان و یقین کو مزید پختہ کرے۔ اگر وہ روزی کمانے کے لیے محنت کرتا ہے تو اس لیے کہ وہ دوسروں کے لیے مفید ثابت ہو سکے' نہ صرف اپنا اور اہل و عیال کا بوجھ اٹھائے بلکہ مستحقین کی خبرگیری بھی کر سکے۔ یہ ساری مصروفیات بامقصد ہیں۔ پھر لایعنی مشاغل کے لیے اس کے پاس وقت کہاں سے آئے گا۔ اگر وہ فضول کاموں میں وقت لگائے گا تو اہم اور ضروری فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرے گا اور یہی چیز اسے برے نتیجے تک پہنچائے گی۔ قرآن شریف میں مسلمان کا طرزِ عمل یہ بتایا گیا ہے کہ اگر کسی وقت اسے فضولیات کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو وہ بڑے وقار کے ساتھ گزر جاتا ہے چہ جائیکہ خود ان لغویات اور لہو و لعب کا حصہ بن جائے۔ سورۃ الفرقان میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَ الَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾}

''اور جو لوگ شامل نہیں ہوتے جھوٹے کام میں اور جب گزرتے ہیں کھیل کی باتوں پر تو نکل جائیں بزرگانہ۔'' (ترجمہ شیخ الہند)

یعنی وہ لایعنی مجالس attend نہیں کرتے۔

علامہ قرطبی نے حضرت عکرمہؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ لعب کو جاہلیت میں ''زُور'' کہتے تھے۔ مشہور مفسر مولانا عبدالماجد دریابادی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس کے تحت زمانے کے میلے ٹھیلے' مختلف بازیوں کے جمگھٹے' ناچ رنگ کی محفلیں' تھیٹر سنیما وغیرہ داخل ہیں۔''

کیونکہ یہ تمام امور خیر سے خالی اور رغبت الی المعصیہ کا باعث بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُمت مسلمہ کے اکابرین' مشاہیر' ائمہ' محدثین اور صالحین کی زندگیاں اپنے اپنے دور میں رائج الوقت ہر قسم کے لہو و لعب سے یکسر خالی تھیں۔ سنیما اور تھیٹر تو سلف صالحین کے وقت موجود نہ تھے مگر میلے ٹھیلے اور ناچ گانے کی محفلیں تو دورِ نبویؐ اور عہدِ صحابہ میں بھی موجود تھیں' لیکن نہ کبھی رسول اللہ ﷺ نے ان میں حصہ لیا اور نہ ہی صحابہ کرامؓ نے ان

میں شمولیت کی۔ مگر آج کے مسلمان لہو و لعب کے ان کاموں میں بڑے انہماک کے ساتھ مشغول ہیں۔ نہ صرف اس میدان میں اپنی توانائیاں اور وقت صرف کر رہے ہیں بلکہ دوسروں کی ترغیب کا ذریعہ بھی بن رہے ہیں۔ کاش وہ

قرآن پاک سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کریں اور سورۃ المدثر کی تلاوت کے دوران دوزخیوں کی آواز ان کے کانوں تک پہنچ کر دل میں اتر جائے کہ وہ کہہ رہے ہیں:

{وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ ﴿٤٥﴾}

''مشغلہ میں رہنے والوں کے ساتھ ہم بھی مشغلہ میں پڑے رہتے تھے۔'' (ترجمہ عبدالماجد دریابادی)

ٹیلی ویژن نے رہی سہی کسر پوری کر دی ہے کہ ناچ گانے کی محفلیں ہر گھر میں پہنچ گئی ہیں۔ متقی اور صالح گھرانے بھی دانستہ یا نادانستہ ان محافل کے ''شاہد'' ہو رہے ہیں۔ چونکہ باطل امور نفس کو بہت مرغوب ہوتے ہیں اس لیے بہت جلد انسان ان کی طرف مائل ہو جاتا ہے ۔ اسی انسانی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دورِ نبویؐ میں نضر بن الحارث مختلف ملکوں سے لٹریچر کی کتب لاتا' وہاں کے بہادروں کے افسانے اور قصے سناتا اور لوگوں کو کہتا کہ ان کو سنو اور ان میں جی لگاؤ' قرآن کے وعظ میں کیا رکھا ہے؟ اور ساتھ ہی ایک حسین و جمیل ناچنے والی لڑکی رکھتا۔ اس طرح وہ لوگوں کو اسلام اور قرآن سے دور رکھتا۔ اب بھی جو لوگ مسلمان ہونے کے باوجود فحاشی اور لہو و لعب کی نشرو اشاعت اور تشہیر میں لگے ہوئے ہیں وہ دشمنِ خدا و رسولؐ نضر بن الحارث ملعون کے طریقے پر چل کر فسق و فجور پھیلا رہے ہیں ' اگرچہ وہ اپنے تئیں بہت عقلمند سمجھ رہے ہوں' کیونکہ وہ اس راہ سے بین الاقوامی شہرت اور ڈھیروں دولت کما رہے ہیں ۔ مگر سچ پوچھیے تو یہی لوگ انتہا درجہ کے احمق اور بے وقوف ہیں جو چند روزہ حیاتِ مستعار کی تزئین کی خاطر ابد الآباد کی حیاتِ اُخروی کے لیے عذاب در عذاب جمع کر رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں {فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ} (الحشر:۲) ''عبرت پکڑو اے دیکھنے والو!''

فیصلے کے دن کا انکار

اہل جنت کے پوچھنے پر اہل دوزخ جو چوتھی بات بتائیں گے وہ یہ ہے کہ:

{وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ ﴿٤٦﴾}

''ہم فیصلے کے دن کا انکار کرتے تھے۔''

یوم آخرت پر ایمان اسلام کے بنیادی اور اہم ترین عقائد میں سے ہے جس کی بنا پر ہر مسلمان کا یقین ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ملے گی۔ قیامت کے روز سب لوگوں کا حساب کتاب ہو گا' دنیا میں کیے گئے اعمال کی پڑتال ہو گی اور نتیجہ کے طور پر نیکوکاروں کو جنت میں جگہ ملے گی' جہاں ہر طرح کا آرام چین اور سکھ ہو گا' جبکہ بداعمال لوگوں کو دوزخ میں ڈالا جائے گا جہاں دہکتی ہوئی آگ کا عذاب ہو گا۔

عقیدۂ آخرت کا استحضار انسان کو گناہوں سے دور رکھتا ہے جبکہ آخرت کی طرف سے عدم توجہی آدمی کو

شتر بے مہار بنا دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو تقویٰ کی زندگی پسند ہے اور تقویٰ یہ ہے کہ انسان دنیا میں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھے اور محتاط زندگی گزارے اور احتسابِ آخرت کو کبھی ذہن سے محو نہ ہونے دے تاکہ اگلی زندگی میں اس کے لیے ابدی راحت و آرام ہو اور وہ عذاب الٰہی سے بھی بچ جائے۔ قرآن کریم میں بتایا گیا ہے:

{اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ} (الحجرات:۱۳)

''بے شک تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔''

پس خدا کا محبوب بننے کے لیے تقویٰ کی زندگی بہت ضروری ہے۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہمارے لیے اُسوۂ حسنہ ہے۔ آپؐ نے پوری زندگی رضائے الٰہی کے مطابق گزاری اور کبھی ذاتی خواہش کو اہمیت نہ دی۔ آپؐ کے طریقہ پر چل کر صلحائے اُمت کا بھی یہی معمول رہا۔ انہوں نے اپنی زندگیاں رضائے الٰہی کے تابع رکھیں اور یہ صرف ایمان بالآخرت سے ہی ممکن ہوا۔ جوں جوں ایمان بالآخرت میں ضعف پیدا ہوتا جائے گا توں توں اعمال میں بے احتیاطی راہ پاتی جائے گی۔ اگر عمل

کرتے وقت اس کے نتیجے کا احساس بیدار ہو تو آدمی گناہ سے بچ جاتا ہے اور نیکی کی طرف مائل ہو جاتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ فرمان رسول ﷺ کے مطابق دنیا آخرت کی کھیتی ہے' جو یہاں آج بویا جائے گا وہی وہاں کل کاٹنا ہوگا۔

سورۃ الحدید میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ یومِ آخرت کا نقشہ کھینچا گیا ہے جب ایمان والے مردوں اور عورتوں کا نور ان کے سامنے اور دائیں روشن ہو گا اور وہ اطمینان کے ساتھ اس روشنی میں چل کر جنت کی طرف رواں دواں ہوں گے۔ ان کے پیچھے منافق مرد اور عورتیں ہوں گی جو ان کو آواز دے کر کہیں گے کہ ذرا رُک جائو تاکہ ہم بھی تمہاری روشنی سے کچھ استفادہ کر لیں۔ اس پر ان کو جواب ملے گا کہ ''واپس جائو اور روشنی لے کر آئو''۔ اُس وقت دنیا میں واپسی تو ممکن نہ ہو گی لہٰذا ان کو یاس و حسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا اور بالآخر وہ جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی فکر آخرت کے بغیر گزاری' من مانی کی' خواہشِ نفس کے غلام بنے رہے' ''بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' پر عمل پیرا رہے' دنیا کمانے اور سجانے کی دوڑ میں اپنا سارا وقت اور توانائی خرچ کر ڈالی اور کبھی نہ سوچا کہ فیصلے کے دن ہمیں روشنی کی ضرورت پڑے گی۔ یہی لوگ ہیں جو عملی طور پر یومِ آخرت کے انکاری رہے۔

سورۃ المنافقون کے اخیر میں بتایا گیا ہے کہ غیر محتاط زندگی گزارنے والوں کو جب اپنا انجام معلوم ہو جائے گا تو وہ خواہش کریں گے کہ اللہ تعالیٰ انہیں تھوڑی مدت کے لیے دوبارہ واپس دنیا میں بھیج دے تو وہ بہت

خیرات کریں گے اور نیکوکار بن جائیں گے۔ مگر افسوس کہ اللہ تعالیٰ ان کو موقع نہ دے گا کیونکہ ان کی موت کے ساتھ مہلتِ عمر بیت چکی۔ اور اسی حسرت و یاس کی حالت میں ان کو آگ کے عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔

ہر طرزِ عمل کا انجام قرآن کریم میں کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے مگر فکرِ آخرت کو نظر انداز کرنے سے انسان کی آنکھوں کے سامنے پردہ آجاتا ہے جس سے وہ بد عملی کا واضح انجام نہیں دیکھ سکتا اور برائیوں میں آگے بڑھتا جاتا ہے۔ آج جو ہر طرف برائیوں

کا دور دورہ ہے اس کی بڑی وجہ یہی عقیدۂ آخرت کی کمزوری ہے۔ بلاشبہ ہر مسلمان آخرت پر یقین رکھتا ہے مگر یہ یقین نظریے کی حد تک رہ گیا ہے' عملی طور پر وہ دنیا کی چمک دمک پر فریفتہ ہو کر عقیدۂ آخرت کا انکاری ہو چکا ہے۔ ورنہ مسلمان اور یہ بد عملی؟ کونسا جرم اور گناہ ہے جو اس وقت نہیں ہو رہا۔ قاتل کی سزا جہنم ہے مگر بے گناہوں کے گلے کون کاٹ رہا ہے؟

یومِ آخرت کا ذکر قرآن پاک میں جابجا موجود ہے' مگر خود قرآن پاک کی تلاوت کرنے والوں میں کتنے ہیں جن کو فکرِ آخرت دامن گیر ہے۔ قرآن کی ایک یاد دہانی ملاحظہ ہو:

{یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ لْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۱۹﴾ لَا یَسْتَوِیْۤ اَصْحٰبُ النَّارِ وَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآىِٕزُوْنَ ﴿۲۰﴾} (الحشر)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' اور چاہیے کہ ہر شخص دیکھ لے کہ کل کے لیے کیا آگے بھیجتا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ اور تم ان لوگوں کی مانند نہ ہو جائو جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا' پھر اللہ نے ان کو خود ان کے جی بھلا دیے۔ وہی لوگ فاسق ہیں' نہیں برابر آگ والے اور جنت والے' رہے جنت والے تو وہی ہیں مراد پانے والے۔''

ہوش مندی کا تقاضا ہے کہ آخرت پر ایمان لانے والے انجام کار کی پشیمانی' پچھتاوے' حسرت اور عذابِ جہنم سے بچنے کے لیے قرآن پاک کی آفاقی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے رسالت مآب ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کو ہر وقت پیشِ نظر رکھیں۔ دوسری شخصیات کے کردار کی جانچ کے لیے بھی اُسوۂ حسنہ ہی کو معیارِ حق سمجھیں' ورنہ رسول پاک ﷺ کے آستانہ کو چھوڑ کر دوسری ''بڑی'' شخصیات کو محبوب بنانے کا نتیجہ تو بس محرومی اور ناکامی ہی نکلے گا۔ قرآن پاک ایسے لوگوں کی حالت زار اس طرح بیان کرتا ہے:

{وَ یَوۡمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیۡہِ یَقُوۡلُ یٰلَیۡتَنِی اتَّخَذۡتُ مَعَ الرَّسُوۡلِ سَبِیۡلًا ﴿۲۷﴾ یٰوَیۡلَتٰی لَیۡتَنِیۡ لَمۡ اَتَّخِذۡ فُلَانًا خَلِیۡلًا ﴿۲۸﴾ لَقَدۡ اَضَلَّنِیۡ عَنِ الذِّکۡرِ بَعۡدَ اِذۡ جَآءَنِیۡ ؕ وَ کَانَ الشَّیۡطٰنُ لِلۡاِنۡسَانِ خَذُوۡلًا ﴿۲۹﴾ وَ قَالَ الرَّسُوۡلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوۡمِی اتَّخَذُوۡا ہٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَہۡجُوۡرًا ﴿۳۰﴾ }(الفرقان)

''اُس دن ستم گر شخص اپنے ہاتھوں کو چبا چبا کر کہے گا: ہائے کاش کہ میں نے رسولؐ کی راہ لی ہوتی۔ ہائے افسوس کاش کہ میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوا ہوتا' اس نے تو مجھے اس کے بعد گمراہ کر دیا کہ نصیحت (الذکر یعنی قرآن) میرے پاس آپہنچی تھی۔ شیطان انسان کو وقت پر دغا دینے والا ہے۔ اور رسولؐ کہے گا: ''اے میرے پروردگار بے شک میری اُمت نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔''

وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ

ذکر کا مطلب ہے اللہ کی یاد۔ اللہ تعالیٰ جو ساری کائنات کا خالق و مالک ہے اس قابل ہے کہ اسے ہمہ وقت یاد کیا جائے اور یاد رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر زبان سے بھی ہے اور عمل سے بھی۔ اس دور کے بعض مادہ پرست ذہن جنہیں روحانی بالیدگی میسر نہیں ہے کہہ اٹھتے ہیں کہ زبان سے اللہ کا ذکر چہ معنی دارد۔ مگر یہ ان کی غلط فہمی ہے' کیونکہ صرف زبان سے اللہ کا ذکر بھی اعلیٰ درجہ کی تأثیر کا حامل ہے۔ اگر اسے مادی مثال سے ہی سمجھنا ہو تو ایک سنگلاخ چٹان پر پانی کا قطرہ قطرہ گرتے دیکھئے۔ یہ قطرہ بظاہر نہایت کمزور' حقیر اور ملائم سی چیز ہے' مگر جب یہ لگاتار ایک مدت تک ایک ہی جگہ گرتا رہے تو سنگلاخ چٹان میں سوراخ کر دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ بعض اوقات بظاہر چھوٹا سا عمل پیہم مشق سے حیرت انگیز نتائج پیدا کرتا ہے اور پھر ذکر اللہ تو چھوٹا عمل بھی نہیں۔ خالق کائنات نے قرآن پاک میں اللہ کے ذکر کو سب چیزوں سے بڑا قرار دیا ہے' ملاحظہ ہو سورۃ العنکبوت {وَ لَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ؕ}(آیت ۴۵) ''اور اللہ کا ذکر تو سب سے بڑی چیز ہے۔

کہتے ہیں کہ قیامت کے دن جنتیوں کے لیے سب سے بڑی نعمت دیدارِ الٰہی ہو گا۔ اس میں ایسی لذت ہو گی کہ ناظرین رویت باری تعالیٰ سے نظر اِدھر اُدھر کرنا گوارا نہ کریں گے۔ بھلا اس ہستی کا ذکر بے اثر ہو سکتا ہے؟

دنیا میں ہمیں کسی شخص سے اس کے باکمال ہونے یا باکردار ہونے کی وجہ سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ مشاہدہ ہے کہ جب کسی محفل میں ہماری اس پسندیدہ شخصیت کا ذکر ہو گا تو ہماری دلچسپی اس میں بڑھتی جائے گی۔ نیز ہم کسی محفل میں بیٹھے ہوں تو ہمارا دل چاہے گا کہ کسی نہ کسی طور اپنی محبوب شخصیت کا تذکرہ شروع کریں' یعنی اس کا ذکر اپنے

احباب کے سامنے کریں۔ یہی تو ذکر ہے بلکہ ایک شخص کو ایک خاص فن محبوب ہے' وہ اس فن کا شیدائی ہے' تو اپنے محبوب فن کا ذکر اور تذکرہ اس کے لیے دلچسپی کا باعث ہو گا۔

اب سمجھئے کہ انسان کو اشرف المخلوقات بنانے والا کون ہے؟ اسے موزوں قامت' حسین شکل و صورت' ذہنی اور دماغی صلاحیتیں جن سے وہ کائنات کو مسخر کرنے کے قابل ہوا' کس نے دیں؟ اللہ نے۔ تو بس جو شخص کائنات کی اس اشرف صنف یعنی بشریت سے تعلق رکھتا ہے اس کا سب سے بڑا محسن اللہ تبارک و تعالیٰ ہے اور محسن کے سامنے اظہارِ نیازمندی اخلاق کی ایک معروف خوبی ہے۔ محسن کے ساتھ محبت اور لگاؤ فطرتِ سلیمہ کا مسلّمہ تقاضا ہے۔ اگر کوئی شخص انسانیت سے عاری نہ ہو تو اللہ کے ساتھ اس کی انتہائی محبت عالمگیر سچائی کا درجہ رکھے گی۔ اسی حقیقت کو قرآن شریف میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ ایمان والے ہیں ان کو سب سے زیادہ محبت اللہ کے ساتھ ہے۔ دیکھئے سورۃ البقرۃ:

{وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَنۡدَادًا یُّحِبُّوۡنَہُمۡ کَحُبِّ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ } (آیت ۱۶۵)

''اور بعض لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو۔ ان سے محبت ایسی رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ کی' اور ایمان والوں کو اس سے زیادہ تر ہے محبت اللہ کی''۔

ظاہر ہے کہ خدا کی محبت اسی کو ہو گی جو حق شناس اور حقیقت آشنا ہو گا۔ پھر انبیائے کرام علیہم السلام فہم و بصیرت' عقل و سمجھ' حق شناسی اور حقیقت آشنائی کی معراج پر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی محبت کا مرکز و محور ذاتِ الٰہی اور دن رات کا وظیفہ ذکرِ الٰہی ہوتا تھا۔ چونکہ انبیاء و رسل مقصدِ حیات سے آگاہ تھے اسی لیے انہوں نے نہ صرف خود اللہ کے ذکر کو ہمہ وقت کا معمول بنایا بلکہ نصح و خیر خواہی کے جذبے کے تحت تمام انسانوں کو بھی ذکرِ الٰہی کی طرف دعوت دی۔ ایک شخص کو جس چیز کی معرفت ہو گی وہی اس کی قدر کر سکے گا' ع قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند گوہری!

ایک ہی چیز کی مختلف اشخاص کے ذہنوں میں قدر و قیمت مختلف ہو گی یعنی افراد کو اس شے کی معرفت کے تناسب سے ہی قدر ہوتی ہے اور ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت سب سے زیادہ انبیاء و رسل کو ہوتی ہے' چنانچہ وہی اس عظیم الشان ہستی کے صحیح قدر دان ہوتے ہیں اور ہمیشہ ذکر الٰہی میں مشغول نظر آتے ہیں۔

چونکہ انسان کا محسنِ اعظم اللہ تبارک و تعالیٰ ہے لہٰذا شدید ترین محبت اسی کا حق ہے۔ اگر کوئی شخص محسنِ حقیقی کو چھوڑ کر شدید ترین محبت کا حق کسی دوسرے کے لیے تسلیم کرتا ہے تو یہ سب سے بڑی حماقت ہے اور اسی کو شرک کہتے ہیں اور یہ بدترین گناہ ہے جو اللہ کے غضب کو بھڑکاتا ہے۔ دنیا میں ہم صاحبِ کمال لوگوں سے ان کی صلاحیتوں کے مظاہرے پر متأثر ہوتے ہیں اور ان کی محبت اور کشش کا پیدا ہو جانا بھی فطری امر ہے' مگر یہ حقیقت کبھی نظر سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ ان صاحبِ کمال لوگوں کی یہ صلاحتیں اسی خدائے واحد کی عطا کردہ ہیں جس کے قبضہ میں عزت دینا اور ذلت دینا ہے۔ یہ صلاحیتیں کسی کی ذاتی نہیں ہیں' بلکہ خدا کی عطا کردہ ہیں۔ وہ کسی کو صلاحیت دے بھی سکتا ہے اور چھین بھی سکتا ہے۔ اگر یہ حقیقت انسان کو مستحضر رہے تو اس کے جادۂ حق سے بھٹکنے کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔

اللہ کا ذکر روح کی غذا اور قلب کی تسکین ہے۔ اس کی لذت سے وہی شخص آشنا ہے جسے اس کا تجربہ ہے۔ ذکر اللہ کا سب سے بڑا مظہر خود قرآن پاک یعنی کلامِ الٰہی ہے' اسے "الذکر" کہا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۃ الحجر:

{اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ ﴿۹﴾}

''بے شک ہم نے ہی اس ذکر (یعنی قرآن) کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

گویا قرآن پاک سراسر ذکر ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمان قرآن کی عظمت کے کماحقہ قائل تھے۔ ان کے ہاں بہترین مشغولیت قرآن کا سیکھنا اور سکھانا تھا۔ بخاری شریف میں حضرت عثمانؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((خَیۡرُکُمۡ مَنۡ تَعَلَّمَ الۡقُرۡآنَ وَعَلَّمَہٗ))

''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن کا علم حاصل کرے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے''۔

یہی قرآن سینوں کی بیماریوں یعنی اخلاقی کمزوریوں کا علاج ہے۔ دیکھئے سورۃ یونس:

{یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ مَّوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ ۙ وَ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۷﴾}

''اے لوگو تمہارے پاس نصیحت آئی ہے تمہارے ربّ کی طرف سے اور یہ شفا ہے اس کے لیے جو سینوں میں ہے اور ہدایت اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے''۔

نیز دیکھئے سورۂ بنی اسرائیل:

{وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ}

''اور ہم نے اتارا قرآن جو شفا اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔''

اللہ کے ذکر سے طمانیتِ قلبی نصیب ہوتی ہے۔ دیکھئے سورۃ الدہر:

{اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ؕ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿۲۸﴾}

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور چین پاتے ہیں ان کے دل اللہ کی یاد سے ۔ سنتا ہے ! اللہ کی یاد سے ہی چین پاتے ہیں دل۔''

علاوہ ازیں بیہقی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بنی آدم کے قلوب پر اسی طرح زنگ چڑھ جاتا ہے جس طرح پانی لگ جانے سے لوہے پر زنگ آجاتا ہے''۔ عرض کیا گیا: حضور ﷺ ! دلوں کے اس زنگ کے دور کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''موت کو زیادہ یاد کرنا اور قرآن کی تلاوت !''۔

بات ہو رہی ہے اللہ کے ذکر کی۔ تو قرآن میں نماز کو بھی اللہ کا ذکر کہا گیا ہے۔ دیکھئے سورۂ طٰہٰ:

{اِنَّنِيْۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾}(آیت ۱۴)

''بیشک میں اللہ ہوں، کوئی معبود نہیں سوائے میرے، پس میری عبادت کرو اور قائم کرو نماز میرے ذکر کے لیے۔''

قرآن پاک میں ہے کہ ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے رہو۔ دیکھئے سورۃ النساء:

{فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ} (آیت ۱۵)

''اللہ کا ذکر کرو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں کے بل لیٹے۔''

ترمذی شریف کی روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ نے ذکر اللہ کو ''افضل الاعمال'' فرمایا ہے:

''حضرت عبداللہ بن یسرؓ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا: یارسول اللہ ! آدمیوں میں کون بہتر ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''جن کی عمر زیادہ ہو اور عمل اچھے ہوں''۔ پھر اس

نے پوچھا: اعمال میں کونسا عمل بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''یہ کہ تم دنیا سے رخصت ہو اور اس وقت تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر ہو''۔

ظاہر ہے کہ یہاں زبان کے ذکر ہی کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔

اللہ کے ذکر یعنی اس کی حمد وثنا کے لیے موزوں ترین کلمات کون سے ہیں۔ اوّل تو قرآنی آیات ہیں جو ذکر کا اوّلین مصداق ہیں' کیونکہ قرآن تو ہے ہی الذکر' دوسرے وہ جملے جو حدیث کی کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے تعلیم کردہ ہیں' اصلاً وہ بھی آیاتِ قرآنی سے ماخوذ ہیں' مثلاً تسبیح' تحمید' تمجید' تکبیر وغیرہ۔

جہاں تک اوقات ذکر کا تعلق ہے تو ذکر الٰہی کے لیے ہر وقت موزوں ہے' البتہ خصوصی طور پر صبح وشام کے اوقات اور فراغت کا کوئی بھی وقت مناسب ہے۔ جس طرح ہر کام کے لیے کچھ پیشگی شرائط ہوتی ہیں جو اس کام کے مثبت نتائج کے لیے لوازم کا درجہ رکھتی ہیں اسی طرح ذکر اللہ کے لیے بھی کچھ لوازمات ہیں۔ اوّل زندگی کے معمولات معصیت سے پاک ہوں' یعنی خشیت الٰہی کا عنصر اقوال و افعال میں نمایاں ہو۔ دوم رزق حلال کا اہتمام اور آخری بات یہ کہ ذکر اللہ میں خلوص ہو اور یہ معمولی سی ریاکاری اور ادنیٰ سی نمائش سے بھی پاک ہو اور اس کا مقصد صرف حصول رضائے الٰہی ہو اور بس!

کُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ

بدعت کا لفظی معنی نئی چیز' ایجاد اور انوکھے کے ہیں لیکن اسلامی اصطلاح میں یہ لفظ ایسے امور پر بولا جاتا ہے جو دین میں نئے نکالے گئے ہوں۔ اُمور دین میں ہر قسم کے اضافے کو مذموم قرار دیا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی دنیوی زندگی کے آخری ایام میں تکمیل و اتمام دین کی خوشخبری سنا کر یہ بات بالکل واضح کر دی گئی کہ اُمور دین میں اب کسی قسم کی کوئی خامی باقی نہیں رہی بلکہ دین تکمیل اور اتمام کے درجے کو پہنچ چکا ہے۔ مشاہدہ بھی یہی بتاتا ہے کہ درجۂ کمال صرف ایک ہی ہوتا ہے جو کمی بیشی کا متحمل نہیں ہو سکتا جس طرح کمی درجہ کمال میں نقص پیدا کرتی ہے اسی طرح اضافہ بھی قصور پیدا کرتا ہے کیونکہ جس شے میں اضافے کو قبول کرنے کی گنجائش موجود ہو وہ کامل نہیں ہو سکتی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا

:

''جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی بات نکالی جو اس میں نہیں ہے پس وہ مردود ہے''۔ (مشکوۃ بحوالہ بخاری و مسلم)

حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ پیش بندی نہ کی جاتی تو دین مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا اور اس میں تکمیلی شان بھی باقی نہ رہتی' جو چاہتا حسن و خوبی کے نام پر اس میں اضافہ کرتا اور یہ اضافے اصل دین کا اسی طرح حلیہ بگاڑ دیتے جس طرح یہود و نصاریٰ نے اسلامی تعلیم کا ستیاناس کیا۔

دین کا پورا نظامِ عہد رسالت کے آخری ایام میں جاری و ساری ہو گیا اور پھر خلافت راشدہ کے دور میں بھی رائج رہا اگر دورِ صحابہ میں چند چیزیں دین میں اضافہ معلوم ہوتی ہیں تو ان کی حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرام نے باہمی مشورے سے کسی کام کو منشأ رسالت سمجھا اور یہ بھی جانا کہ عہد رسالت میں اس کی ترویج میں کیا چیز حائل تھی

چنانچہ اس کو رائج کیا ۔ایسے امور کو اوّل تو ہم اس لیے بدعت نہیں کہتے کہ صحابہ کرام مزاج شناسِ رسول تھے۔ یہ بات محال ہے کہ وہ کسی بدعت پر اجماع کرتے۔ دوم اس لیے کہ خود رسول پاکؐ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طریق کار کو اپنی سنت اور اُمت کے لیے قابل تقلید قرار دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا تم پر میری سنت اور میرے خلفائے راشدین کی سنت کو اختیار کرنا لازم ہے۔ مثال کے طور پر تراویح کا نظام نہ عہد رسالت میں رائج تھا اور نہ ہی عہد صدیقی میں۔ مگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں نماز تراویح کا نظام قائم کر دیا جس پر تمام صحابہ کا اجماع ہوا اور کسی نے مخالفت نہ کی۔ اور اُمت نے اس کو سنت کے طو رپر اپنایا۔ نظامِ تراویح کی ترویج کے ضمن میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سامنے یہ بات بالکل واضح تھی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رمضان شریف کی راتوں میں عبادت نہایت پسندیدہ ہے نیز یہ کہ نظامِ تراویح کے قیام سے آنحضرت ﷺ کو اس بات کا قوی امکان تھا کہ یہ عبادت اپنی عظمت کی وجہ سے فرضیت کے درجے میں آجائے گی اور یہ بات اُمت کے عام افراد پر بھاری ہو گی ۔ دورِ رسالت کے اختتام پر سلسلہ وحی بند ہو جانے کے باعث رمضان کی راتوں کے قیام کا فرض ہونا ممکن نہ رہا تو امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جملہ صحابہ کرام کے مشورے سے رسول پاکؐ کی پسندیدگی کے باعث اور حصولِ رضائے خداوندی کے لیے نظامِ تراویح کو رائج کر دیا گیا۔ وگرنہ عہد صحابہ میں بدعت کی روک تھام کا پورا انتظام کیا گیا اور کسی ایسی بات کو دین میں داخل نہ ہونے دیا گیا جس کی نظیر عہد رسالت میں نہ ملتی ہو۔ کیونکہ اس ضمن میں جب لوگوں نے بیعت رضوان والے ببول کے درخت کا احترام کرنا اور زیارت کے لیے جانا شروع کر دیا تو انہوں نے اس درخت کو جڑوں سمیت اُکھاڑ پھینکا کہ اس طرح کوئی بدعت رواج نہ پاجائے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
''سب سے بہتر بات خدا کی کتاب اور بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے اور بدترین کام وہ ہیں جن کو دین میں نیا نکالا گیا ہو۔ اور ہر بدعت یعنی دین میں نئی

نکالی ہوئی چیز گمراہی ہے''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)

جو لوگ بدعت کی برائی میں لچک پیدا کرتے اور حسنِ ظن اور حسنِ نیت کی دلیل پیش کرتے ہیں ان کا خیال صحیح نہیں کیونکہ بدعت تو کہتے ہی اس کام کو ہیں جو دین کا کام سمجھ کر اور حصول رضائے الٰہی کے لیے اختیار کیا جائے لیکن اس کی مثال سنت میں نہ ملتی ہو۔ کیونکہ دین میں نئی چیز کا اطلاق اس چیز پر تو ہو نہیں سکتا جس میں فی نفسہٖ برائی موجود ہو۔ بلکہ برائی کی تو دین میں سرے سے گنجائش ہی نہیں رکھی گئی۔ البتہ بزعم فکر انسانی دین میں اچھائی کے اضافے کا امکان موجود تھا جسے آنحضرت ﷺ نے پوری صراحت کے ساتھ ختم کر دیا تاکہ دین اپنی اصلی صورت میں اور تکمیلی شان کے ساتھ قائم رہے۔

اسلامی ممالک میں عام طور پر اور برصغیر میں خاص طور پر جن بدعات کو اختیار کیا گیا ہے' ان کے پیچھے بھی حب رسول اور حصولِ رضائے الٰہی کے جذبے کا دعویٰ کیا جاتا ہے لیکن اس بات کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ حب رسول اور رضائے الٰہی کی بہترین صورت تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اختیار کر رکھی تھی اگر حبِّ رسول اور حصولِ رضائے الٰہی کے کچھ تقاضے ان بدعات کو اپنا کر پورے کیے جا رہے ہیں جو صحابہ کے دور میں رائج نہ تھیں تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اسلام میں خامی تسلیم کرنا پڑتی ہے جو محال ہے کیونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت کے طرزِ عمل کو نبی پاک ﷺ نے قابل اعتماد جانا ہے اور خدائے بزرگ و برتر نے اس طائفہ کی تعریف کی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حبِّ رسول اور دینی استقامت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے چھوٹی سے چھوٹی سنت کو مضبوطی سے پکڑا اور عملاً اختیار کیا۔ انہوں نے پوری زندگی قرآن و سنت کے مطابق بسر کی البتہ حبِّ رسول اور دینی استقامت کی نمائش کے لیے جلوس اور میلاد کی محافل منعقد نہ کیں۔ ذکر نبیؐ تو خود خدا نے بلند کر دیا جو عہد رسالت' عہد صحابہ اور موجودہ دور میں بھی بلند ہی ہے اور بلند رہے گا لیکن اگر بلند بانگ نعروں ' بے ہنگم اجتماعات ' پراز تعصب مجالس اور نمائشی جلسوں سے وَ رَفَعْنَا لَکَ ذِکْرَکَ ﴿۴﴾ کا تقاضا پورا ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ تقاضا نہ عہد رسالت میں پورا ہوا نہ عہد صحابہ میں۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ استقامت فی الدین کے

تقاضے جس طرح جماعت صحابہ نے پورے کیے وہی جامع اور مکمل ہیں۔ آج بھی اگر حبِّ رسول اور رضائے الٰہی کے جذبہ کے تحت بدعات کو رواج دینے والے لوگ اپنے دیگر امور میں تابع سنت نظر آئیں تو ان کے جذبے کو حسنِ ظن کے تحت لانے کا جواز پیش کیا جا سکتا ہے لیکن جب ان نمائشی محافل میں اکثریت بے عمل بلکہ بد عمل لوگوں کی ہوتی ہے جو نماز کی پابندی' وعدے کی پاسداری' اخلاق کی بلندی' کسب رزقِ حلال کی اہمیت سے بھی بے خبر ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو کسی نمائشی جلوس میں نعرے لگاتے دیکھ کر اللہ کا نبیؐ اور خود خدائے علیم و خبیر تو دھوکہ نہیں کھا سکتے البتہ بے شعور لوگوں میں وہ اپنے عاشق رسول ہونے کا رعب جما سکتے ہیں۔

اصل بات تو یہ ہے کہ دین میں شامل تمام امور کے تقاضے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بطریق احسن پورے کر دیئے اور اُمت کی راہنمائی کر دی ۔ اب دین میں کسی امر کا اضافہ خواہ وہ کتنی ہی حسن نیت اور حصولِ رضائے الٰہی کے لیے ہو' قابل قبول نہیں۔ قرآن پاک کی سورۃ الحدید کے آخری رکوع میں مذکور ہے کہ نصاریٰ نے گناہوں سے بچنے اور حصولِ رضائے الٰہی کی خاطر ترک دنیا کی بدعت اختیار کی جو اللہ تعالیٰ نے ان پر لازم نہ کی تھی چنانچہ وہ اس کو نباہ نہ سکے۔ معلوم ہوا کہ گناہوں سے بچنے اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے وہ کوشش اور طرزِ عمل بھی بدعت ہے جو شارع نے دین میں شامل نہ کیا ہو۔ حالانکہ گناہوں سے بچنا اور حصولِ رضائے الٰہی امر محمود ہے مگر کوئی بات محمود نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کا طریقہ تعلیماتِ نبوی کے مطابق نہ ہو۔ تین دن کے بھوکے کو روزے کا ثواب نہ ملے گا مگر سنت نبوی کے مطابق چند گھنٹے کا روزہ مقبول و مبرور اور کارِ ثواب ہو گا۔

حدیث پاک میں بار بار کتاب و سنت پر انحصار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ حضرت عرباض بؓن ساریہ سے روایت ہے' آپؐ نے فرمایا:

''پس تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے اور اختلافِ کثیر دیکھے ایسی حالت میں تم پر لازم ہے کہ میرے اور میرے خلفائے راشدین مہدیین کا

طریقہ۔ تم اس کے ساتھ چمٹ جاؤ اور اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑے رہو اور بچو تم دین میں نئی باتیں پیدا کرنے سے اس لیے کہ ہر نئی بات بدعت ہے اور بدعت گمراہی ہے''۔ (مشکوۃ)

حبِّ رسول اور حصولِ رضائے الٰہی کا مسنون طریقہ تو یہ ہے کہ اُسوۂ حسنہ کو اپنایا جائے۔ اظہارِ دین کے پیغمبرانہ مشن کو پورا کرنے میں کوشش کی جائے۔ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کر کے ناقابلِ شکست قوت بنا دیا جائے۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو تمام نمائشی اور اضافی امور بے معنی اور فریبِ محض ہیں کیونکہ اگر ہم حبِّ رسول اور استقامت چاہتے ہیں تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے طرزِ عمل سے اچھی مثال کہیں اور سے نہیں

مل سکتی۔

دین اسلام خالق کائنات کا مرتب کردہ دین ہے اور انسانوں کے لیے ہے جنہیں خود اس علیم و خبیر نے بنایا ہے لہٰذا اس دین کا کامل ہونا واضح ہے اگر غور کیا جائے تو اس کی ہر بات میں تکمیلی شان نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام نے دوسرے ادیان باطلہ کی کسی چیز کو اخذ نہیں کیا بلکہ دوسرے ادیان اور نظاموں نے دین اسلام سے بہت سی باتیں اخذ کیں لیکن یہ دین اسلام کے پیروکاروں کا زوال اور دین کی تکمیلی شان سے بے خبری ہے کہ ان کو دوسرے نظاموں میں حسن اور کشش نظر آنے لگی۔ برصغیر میں ہندو اور مسلمان سینکڑوں سال ساتھ ساتھ رہے۔ ہندو اپنے ایک تہوار پر اپنی عمارات پر روشنی کرتے تھے مسلمانوں نے بھی ایک تہوار ایجاد کر لیا اور اپنی عمارتوں پر چراغاں کے علاوہ آتش بازی کا مظاہرہ بھی کرنا شروع کیا وہ یہ بات بھول گئے کہ دین اسلام تو فضول خرچی اور ریاکاری (نمود و نمائش) سے روکتا ہے۔ عیسائیوں نے یومِ ولادتِ مسیحؑ پر جشن کا اہتمام کیا مسلمانوں نے ان کی نقالی کی اور لغویات میں نصاریٰ کو پیچھے چھوڑ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح عیسائیوں نے جذبہ فراریت کے تحت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات کو چھوڑ کر نمائش محبت رسول پر اکتفا کیا' اسی طرح مسلمان بھی کتاب و سنت کے احکام کی پیروی چھوڑ کر ناقص مسلمان ہو گئے تو اس نقص کو چھپانے کے لیے وہ بھی نمائشی اظہارِ محبت کے ذریعے بدعملی کے باوجود بزعمِ خویش اتقیاء و اصفیاء بن رہے ہیں۔

دین اسلام کی تعلیم تو یہ تھی کہ رسول پاکؐ کے طریقوں کو اپنایا جائے اور آپؐ کے اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی زندگیوں کے مطابق طرزِ عمل اختیار کر کے صحت مند اسلامی معاشرہ استوار کیا جائے لیکن سہل انگاری' غفلت 'سستی' کم ہمتی اور ضعفِ ایمان نے اصل سے توجہ ہٹا کر خود ساختہ رسوم کی پیروی پر آمادہ کر دیا۔ اور چند نمائشی طریقوں سے حصول مقصد کی باطل اُمید پیدا کر دی۔ رسول پاک ﷺ کا فرمان ہے جسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

''جس شخص نے میری اُمت کے بگڑنے کے وقت میری سنت کو اپنا راہنما بنایا اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا''۔ (مشکوٰۃ)

بدعات کے خوگر لوگوں پر جب بدعات کی مذمت واضح کی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں اگر نئی چیزیں مثلاً عینک' لائوڈ سپیکر' ہوائی جہاز' جدید طرزِ تعمیر کو اختیار کرنا جائز ہے تو گیارہویں شریف' عرس اور تعزیے' محافل میلاد کیوں ناجائز ہوئیں جبکہ ان میں انفاق فی سبیل اللہ اور درود و سلام بھی ہوتا ہے لیکن یہ بات کہتے ہوئے وہ بھول جاتے ہیں کہ دین میں نئی چیز بدعت ہوتی ہے مگر دنیا کی نئی چیزیں ایجادات کہلاتی ہیں جن سے فائدہ اٹھانا جائز ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ جب معروف سیاسی' سماجی' مذہبی اور قومی راہنمائوں کی سالگرہ منائی جاسکتی ہے تو نبی

اکرم ﷺ کے میلاد منانے میں کیا حرج ہے تو یہاں بھی غلط فہمی واضح ہے کہ سیاسی اور قومی اہمیت کی شخصیات کے نام اور کارناموں کو زندہ رکھنے کے لیے ہم ان کی یاد میں ایام مناتے ہیں اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو ان نامور ہستیوں کے معدوم ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن آنحضرت ﷺ کی حیثیت ان لوگوں سے مختلف ہے کیونکہ آپؐ کے ذکر کی بلندی اور دوام کا خود کار نظام خالق کائنات نے دنیا میں جاری فرما دیا ہے لہٰذا اس بات کی حاجت ہی نہیں رہی کہ مصنوعی طریقوں سے آپؐ کے ذکر کو بلند کیا جائے بلکہ ایسا کرنے سے حسن نیت کے باوجود منفی نتائج برآمد ہونا لازمی ہیں کیونکہ دیگر شخصیات کے ساتھ ہمارا جو تعلق ہے وہ محض دنیاوی ہے لیکن آنحضرت ﷺ کے ساتھ جو تعلق ہے وہ سراسر دینی ہے اور دینی تعلق کے تقاضے دنیاوی تقاضوں سے

مختلف ہیں اس فرق کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ کمالِ محبت کے باوجود خلافت راشدہ میں کبھی ربیع الاول کے مہینے میں ذکر رسول کی خاطر اجتماعی محافل میلاد کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

بعض لوگ نفلی نوعیت کی عبادات کو مستقلاً اختیار کر لیتے ہیں اس حد تک تو یہ بات مستحسن ہے لیکن جب اپنے نفلی معمولات کو پوری امت پر لازم قرار دینے کی کوشش کی جائے اور اختیار نہ کرنے والوں کو مطعون کیا جائے تو یہ امر بدعت کہلاتا ہے کیونکہ یہ دین میں نئی بات ہے۔ پوری اُمت کے لیے عبادات اور وظائف کو لازم قرار دینا صرف پیغمبر خدا کا منصب ہے ۔ مذکورہ عمل اختیار کرنے والے یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے اختیار سے تجاوز کر کے پیغمبر کی حیثیت اپنا رہے ہیں جو شرک فی الرسالت کا ارتکاب ہے۔

خود رحمت للعالمین کا اُسوہ یہ ہے کہ آپؐ نے اپنے نفلی معمولات اُمت پر واضح تو فرما دیے لیکن لازم نہ کیے بلکہ اختیاری رکھے تاکہ اُمت پر بوجھ نہ ہو تو آج کون شخص پوری اُمت کے لیے کوئی نیا عمل تجویز کر کے رائج کر سکتا ہے۔

آج کے دور میں بدعات کو ختم کر کے صحیح اسلامی طرزِ زندگی اپنانے کی ضرورت ہے۔ پس سنت کے احیاء میں جس قدر محنت ہو سکے کرنا چاہیے۔ یہی طریقہ حصولِ حبِّ رسولؐ کے لیے مستند اور مجرب ہے۔

مقامِ رسالت اور اس کے تقاضے

محاورہ ہے کہ ''گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی'' اگر تجھے لوگوں کے مقام و مرتبے میں فرق نہیں تو تُو حق شناس نہیں ہے۔ یعنی لوگوں کے منصب اور حیثیت سے واقف ہونا ضروری ہے تاکہ حقوق کی ادائیگی بطریق احسن ہو سکے۔ والدین کے حقوق وہی شخص پورے طور پر ادا کر سکے گا جو والدین کی عظمت سے آگاہ ہو گا۔ اسی اصول کی وضاحت ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ ''قدرِ زر زرگر بداند قدرِ جوہر جوہری''۔ یعنی سونے کی قدر اسی کو ہو گی جو سونے کی شناخت رکھتا ہو' اسی طرح جواہرات کی قیمت تو جواہر شناس ہی لگا سکتا ہے۔ ہم اپنے استاد کو راہ چلتا دیکھتے ہیں تو ادب کے ساتھ اس کے سامنے جھک جاتے ہیں' مگر اسی اُستاد کے پاس سے سینکڑوں دوسرے لوگ بغیر ادب آداب کے گزر جائیں گے' کیونکہ وہ اس کو پہچانتے نہیں۔ پس بادنیٰ تامل یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ جب ہم کسی شخص کے مقام و مرتبہ سے واقف نہ ہوں گے تو اس شخص کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت ہم کیسے متعین(determine) کریں گے؟ چنانچہ مقامِ رسالت سے آگاہی ہر مسلمان پر لازم ہے تاکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اپنا تعلق صحیح بنیادوں پر استوار کر سکے۔

سادہ انداز میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص کلمہ طیبہ پڑھ لیتا ہے اس پر مقامِ رسالت تو واضح ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ بات کچھ تشریح طلب ہے' کیونکہ مسلمانوں میں بہت سوں کو رسول اللہ ﷺ کی شرعی حیثیت اور مقام و مرتبہ کے متعلق کئی طرح کی غلط فہمیاں ہیں۔ جب تک وہ غلط فہمیاں دور نہ ہوں اور مقامِ رسالت سے آگہی نہ ہو حقوق کی ادائیگی کماحقہ کیسے ممکن ہو سکتی ہے!

اطاعت

حضرت محمد ﷺ کی ممتاز ترین حیثیت اللہ کے رسول کی ہے۔ اللہ نے آپ کو برگزیدہ کیا' وحی کے ساتھ سرفراز کیا' منصبِ رسالت پر مأمور کیا اور لوگوں پر آپؐ کی اطاعت لازمی قرار دی' بلکہ رسول کی اطاعت کو خود اللہ کی اطاعت قرار دیا:

{مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ} (النساء:۸۰)

''جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی۔''

رسول کے علاوہ یہ کسی کا منصب نہیں۔ ماں باپ کا بہت بڑا درجہ ہے لیکن وہ بھی رسول کے حکم کے تابع ہے۔ اگر وہ بھی کوئی ایسا حکم دیں جس کی رسول اجازت نہ دیتا ہو تو ان کا حکم بھی نہیں مانا جائے گا۔ اس کی وجہ بھی قرآن پاک میں بتا دی گئی کہ:

{وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ ۳ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ ۴} (النجم)

''پیغمبر اپنی خواہش سے نہیں بولتا مگر وہی کہتا ہے جو اس کی طرف وحی کی جاتی ہے۔''

جب رسول کی زبان پر سراسر حق جاری ہے تو آپؐ کی اطاعت ربّ ہی کی اطاعت ہوئی۔ اسی لیے قرآن پاک میں اس مضمون کی بے شمار آیات موجود ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

{يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝ ۳۳} (محمد)

''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور بصورتِ دیگر اپنے اعمال ضائع نہ کر دو''۔

سورۃ الشعراء میں متعدد رسولوں کا اپنی قوم سے یہ خطاب نقل ہوا:

{فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوْنِ ۝ ۱۰۸}

''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو''۔

{وَ اِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا} (النور:۵۴)

''اور اگر تم اس کی پیروی کرو گے تو ہدایت پا لو گے''۔

{وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ} (النساء:۱۳)

''اور جس نے اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کی اللہ اسے باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔''

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے منہ موڑنے کے بھیانک نتائج سے بھی قرآن پاک میں جابجا خبردار کیا گیا ہے۔ دیکھئے:

{وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ۝ ۱۱۵ ٪} (النساء)

''اور جو کوئی خلاف کرے رسول کے بعد اس کے کہ اس پر ہدایت واضح ہو گئی اور پیروی کرے مسلمانوں کی راہ کے علاوہ کسی دوسری راہ کی تو ہم پھیر دیں گے اس کو جدھر کو وہ پھرا اور ہم اس کو جہنم میں داخل کریں گے، اور وہ بری جگہ ہے پھر جانے کی''۔

سورۃ محمد آیت ۳۲ میں پیغمبر کی مخالفت کا انجام حبطِ اعمال بتایا ہے:

{اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ صَدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ شَآقُّوا الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُمُ الۡہُدٰی ۙ لَنۡ یَّضُرُّوا اللّٰہَ شَیۡئًا ؕ وَ سَیُحۡبِطُ اَعۡمَالَہُمۡ ﴿۳۲﴾}

''بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور اللہ کی راہ سے روکتے رہے اور انہوں نے رسول کی مخالفت کی بعد اس کے کہ ان پر ہدایت واضح ہو چکی تھی وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے' البتہ وہ ان کے اعمال ضائع کر دے گا''۔

جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے غافل رہے اور ادھر ادھر بھٹکتے رہے روز محشر ان کی رسوائی دیدنی ہوگی' مگر اُس وقت ان کی آہ و زاری' اعترافِ گناہ' پشیمانی اور پچھتاوا کسی کام نہ آئیں گے۔ بالفاظِ قرآنی:

{یَوۡمَ تُقَلَّبُ وُجُوۡہُہُمۡ فِی النَّارِ یَقُوۡلُوۡنَ یٰلَیۡتَنَاۤ اَطَعۡنَا اللّٰہَ وَ اَطَعۡنَا الرَّسُوۡلَا ﴿۶۶﴾} (الاحزاب)

''جس دن پھیرے جاویں گے مُنہ اُن کے آگ کے اندر' کہیں گے اے کاش ہم نے فرمابرداری کی ہوتی اللہ کی اور اطاعت کی ہوتی رسول کی''۔

پھر رسول کا نافرمان روزِقیامت اپنے ہاتھ کاٹے گا' افسوس کرے گا' مگر بے فائدہ۔ دیکھئے سورۃ الفرقان:

{وَ یَوۡمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیۡہِ یَقُوۡلُ یٰلَیۡتَنِی اتَّخَذۡتُ مَعَ الرَّسُوۡلِ سَبِیۡلًا ﴿۲۷﴾}

''جس دن ظالم اپنے ہاتھ کاٹے گا اور کہے گا اے کاش میں رسول کی ہمراہی اختیار کرتا''۔

ادب و احترام

جس ہستی کو اللہ کا فرستادہ' حق کا ترجمان اور واجب الاطاعت تسلیم کرلیا جائے تو اس کا ادب و احترام کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگرچہ یہ بات ظاہر و باہر ہے تاہم خود ربّ کائنات نے اس کی اہمیت اجاگر کر دی ہے' تاکہ لوگ اس ضمن میں کسی بے احتیاطی کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں گے۔ اگرچہ یہ مضمون قرآن پاک میں کئی جگہ آیا ہے لیکن سورۃ الحجرات میں اس سلسلہ کی راہنمائی واضح ترین صورت میں آئی ہے جہاں رسول اللہ کے ہاں آنے والوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپؐ کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہو کر آپؐ کو آواز نہ دیں' بلکہ کھڑے کھڑے انتظار کریں' اگر آپؐ خود تشریف لے آئیں تو مدعا بیان کر لیں' ورنہ واپس چلے جائیں۔ سورۃ الحجرات میں ارشاد ہوا:

{اِنَّ الَّذِیۡنَ یُنَادُوۡنَکَ مِنۡ وَّرَآءِ الۡحُجُرٰتِ اَکۡثَرُہُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۴﴾ وَ لَوۡ اَنَّہُمۡ صَبَرُوۡا حَتّٰی تَخۡرُجَ اِلَیۡہِمۡ لَکَانَ خَیۡرًا لَّہُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۵﴾}

''یقینا وہ لوگ جو حجروں کے باہر سے آپ کو آوازیں دیتے ہیں' ان میں بہت سے عقل سے عاری ہیں۔ اور اگر وہ رک جاتے یہاں تک کہ آپ خود نکل کر اُن کے پاس آجاتے تو یہ اُن کے لیے بہتر ہوتا' اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے''۔

پھر اسی سورۃ الحجرات میں آپؐ کی محفل میں بیٹھنے والوں کو اس بات کا

پابند کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں ان کی آواز سے اپنی آواز بلند نہ کریں اور جیسے وہ بلند آواز میں ایک دوسرے کو پکارتے ہیں اس طرح چلّا چلّا کر آپؐ کو ہرگز نہ پکاریں۔ ورنہ اتنی سی بات سے ہی ان کے تمام اعمال اکارت چلے جائیں گے جبکہ وہ اس فعل کو معمولی سمجھ رہے ہوں گے:

{یٰٓاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَکُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجۡہَرُوۡا لَہٗ بِالۡقَوۡلِ کَجَہۡرِ بَعۡضِکُمۡ لِبَعۡضٍ اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُکُمۡ وَ اَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲﴾}

''اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبیؐ کی آواز سے بلند مت کرو اور اُن سے اونچی آواز میں بات نہ کرو' جیسا کہ اونچی آواز میں تم ایک دوسرے سے بات کر لیتے ہو' بصورتِ دیگر تمہارے اعمال ضائع ہوجائیں گے اور تم کو خبر بھی نہ ہوگی''۔

یوں ایک مسلمان آپؐ کے ادب و احترام میں کوتاہی کا سوچ بھی نہیں سکتا اور نہ ہی آپؐ کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کر سکتا ہے جن سے ذرّہ برابر بھی ادب کے تقاضے میں فرق آتا ہو۔

محبت

رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر انسان کا محسن کون ہو سکتا ہے جن کے ذریعے سے دولت ایمان نصیب ہوئی جو بخشش کا وسیلہ بن جائے گی۔ پھر انہوں نے انسانوں کے سروں سے وہ بوجھ اتار کر انہیں ہلکا پھلکا کر دیا جو خود انہوں نے اپنے اوپر ڈال رکھے تھے۔ اس طرح انسانوں کو وہ دین یعنی طریق حیات نصیب ہوا جو فطرت کے انتہائی قریب اور انسانی نفسیات کو ملحوظ رکھے ہوئے ہے۔ اس میں آسانیاں ہیں' مشکلات نہیں:

یُرِیۡدُ اللّٰہُ بِکُمُ الۡیُسۡرَ وَ لَا یُرِیۡدُ بِکُمُ الۡعُسۡرَ} (البقرۃ:۱۸۵)

''اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے لیے تنگی پسند نہیں کرتا''۔

یہ رسول اللہ ﷺ کا بہت بڑا احسان ہے۔ اس دین کی سادہ اور عام فہم تعلیمات پر عمل کرنا سہل بھی ہے اور مفید بھی۔ چنانچہ اس احسان کا تقاضا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ

انتہائی محبت کا تعلق رکھا جائے۔ اگرچہ یہ بات بھی منطقی اور عام فہم ہے تاہم اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ رسول اللہ کا حق لوگوں پر خود اُن کی جانوں سے بھی زیادہ ہے:

{اَلنَّبِیُّ اَوۡلٰی بِالۡمُؤۡمِنِیۡنَ مِنۡ اَنۡفُسِہِمۡ} (الاحزاب:٦)

''بلاشبہ نبی(کا حق) تو ایمان والوں کے لیے ان کی اپنی جانوں پر بھی مقدم ہے''۔

یعنی رسول اللہ ﷺ کی ذات کو ہر مؤمن خود اپنے جسم و جان پر ترجیح دے گا اور مخلوق کے ہر فرد بشر سے زیادہ محبت رسول اللہ ﷺ سے رکھے گا۔ حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَلَدِہٖ وَوَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ))

''تم میں سے کوئی اس وقت تک ایمان والا نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کے بیٹے' باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب اور پیارا نہ ہو جاؤں''۔

ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے پوچھا: ''تمہیں مجھ سے کتنی محبت ہے؟'' انہوں نے جواب دیا: ہر شخص سے زیادہ۔ پھر آپؐ نے پوچھا: ''کیا تمہاری اپنی ذات سے بھی زیادہ؟'' اس پر حضرت عمرؓ نے ذرا توقف کیا اور پھر عرض کیا کہ: ہاں یارسول اللہ۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: ((اَلْاٰنَ یَا عُمَرُ!))یعنی 'اے عمر اب تم مؤمن کامل بنے ہو!''۔چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے مقام و مرتبہ سے آگاہی کا تقاضا ہے کہ مسلمان کے دل میں رسول اللہ ﷺ کی محبت مخلوق کی ہر شے بلکہ خود اپنی ذات سے بھی زیادہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے آپؐ کے اشارے پر اپنا جان و مال اور اولاد کو قربان کر دیا۔ آج بھی مسلمانوں میں یہ جذبہ موجود ہے اور وقت آنے پر ہر مسلمان اپنی جان حضور ﷺ پر فدا کرنے کو سعادت سمجھتا ہے۔

اسلامی تاریخ اس قسم کے فدایانہ کارناموں سے بھرپور ہے۔

ختم نبوت

اللہ تعالیٰ جو اپنے بندوں پر مہربان ہے' انسانوں کی ہدایت کے لیے وقتاً فوقتاً پیغمبر بھیجتا ہے۔ ہر پیغمبر کسی مخصوص خطے یا قوم کی طرف بھیجا جاتا۔ ایک وقت میں ایک سے زیادہ پیغمبر بھی زمین پر موجود رہے' مگر حضرت محمد ﷺ کو قیامت تک ہونے والے تمام انسانوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا:

{وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا} (سبا:٢٨)

''اور ہم نے آپؐ کو تمام لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور تنبیہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔''

آپ ﷺ پر دین اسلام کی تکمیل کر دی گئی۔ اب اس ضابطۂ حیات میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ جس طرح اس دین میں کمی کرنا مذموم ہے اسی طرح اس میں ادنیٰ سا اضافہ بھی اس کی تکمیلی شان کو عیب دار ٹھہراتا ہے۔ اب کوئی دوسرا نبی بھی نہیں آئے گا اور نہ ہی وحی نازل ہو گی۔ آپؐ کی نبوت اب قیامت تک کے لیے ہے۔ اس حقیقت کو بھی قرآن میں واضح کر دیا گیا:

{مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَ لٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ}(الاحزاب:۴۰)

''محمد (ﷺ) تم مَردوں میں سے کسی کے باپ نہیں' لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں پر مہر''۔

اپنی زندگی میں رسول اللہ ﷺ نے کئی مرتبہ اس بات کو کھول کر بیان کیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس عنوان کی احادیث تفہیم القرآن' جلد چہارم' ص ۱۴۰ تا ۱۴۴ پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ آپؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا: ''کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ میرے لیے تم ایسے ہو جیسے موسیٰ کے لیے ہارون تھے' لیکن (فرق یہ ہے کہ) میرے بعد کوئی نبی نہیں ہو گا''۔

پس آج اگر کوئی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ کذاب ہے۔ جیسا کہ آپؐ نے اپنے بعد بہت سے نبوت کے جھوٹے دعوے داروں کی پیشین گوئی کی تھی۔ چنانچہ دنیا جانتی ہے کہ آپؐ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے سارے کے سارے کذاب تھے اور اُن کے کردار و عمل میں پیغمبرانہ عصمت و عظمت کا کوئی نشان نہیں ملتا تھا' بلکہ قدم قدم پر اُن کا جھوٹ اور دروغ گوئی ظاہر تھی۔ ان میں سے اکثر نے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو بھی تسلیم کیا مگر خود پر وحی آنیکے دعوے دار بھی ہوئے' لیکن کسی ایک کو بھی عالمِ اسلام میں پذیرائی نہ ملی' بلکہ ذلیل و خوار ہو کر مرے۔ اب قیامت تک کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہی رہے گا اور اسی کلمے کا اقرار کرنے والے اور دل سے یقین اور اعضاء و جوارح سے اس پر عمل کرنے والے ہی بالآخر فلاح سے ہم کنار ہوں گے۔ اس وحیٔ الٰہی کا اعلان رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں فرما دیا:

{اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ؕ} (المائدۃ:۳)

''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور میں نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند فرمایا''۔

پس مقامِ رسالت سے آگاہی کا تقاضا ہے کہ آپؐ کی رسالت کو اختتامی اور تکمیلی شان کے ساتھ مانا جائے اور آپؐ کے بعد کسی بھی قسم کی نبوت یا رسالت کو پوری قوت کے ساتھ مسترد کر دیا جائے۔ کیونکہ جب آخری زمانے میں عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے تو وہ نبی کی حیثیت سے نہیں آئیں گے' بلکہ رسول اللہ ﷺ کے اُمتی ہوں گے اور آپؐ ہی کا کلمہ پڑھیں گے۔

اُسوۂ حسنہ

رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو تمام انسانوں کے لیے مثال قرار دیا گیا ہے۔ جب ہم سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حیاتِ طیبہ میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جسے ذرا سا بھی غیر معیاری قرار دیا جا سکے۔ کوئی ایسی اخلاقی خوبی نہیں ہے جو آپؐ کے کردار

میں نہ پائی جاتی ہو اور کوئی ناپسندیدہ بات ایسی نہیں ہے جس کا صدور کبھی آپؐ کی ذات سے ہوا ہو۔ زندگی میں پیش آنے والے تمام نشیب و فراز سے آپؐ گزرے ہیں مگر ہر قسم کے حالات میں آپؐ کا طرزِ عمل مثالی رہا۔ انتہائی خوشی کے لمحات میں آپؐ کبھی معیار سے فروتر نہیں ہوئے اور اسی طرح کبھی غصے کی حالت میں آپؐ سے غیر معیاری انداز نہیں دیکھا گیا۔ آپؐ نے غریبوں کے لیے نمونہ چھوڑا کہ نادار اور مفلس لوگ بھی پریشان ہو کر ناشکری کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں۔ کئی کئی دن آپؐ کے ہاں چولہا نہ جلتا تھا۔ امیروں اور دولت مندوں کے لیے آپؐ کی زندگی مشعل راہ ہے کہ ایک وقت وہ بھی آیا کہ عرب کی دولت آپ کے قدموں میں آپڑی اور آپ مدینہ کی ریاست کے سربراہ ہو گئے' مگر اس حال میں بھی آپؐ نے عیش و عشرت کا انداز نہیں اپنایا بلکہ انتہائی سادہ زندگی اختیار کی اور دولت کو اپنی ذات پر خرچ کرنے کی بجائے ضرورت مندوں میں تقسیم کیا۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ آپؐ کی پیاری بیٹی فاطمہؓ نے آپؐ سے ایک خادم کا مطالبہ کیا تو آپؐ نے انہیں خادم تو نہیں دیا البتہ تسبیحاتِ فاطمہ کے الفاظ سکھا دیے کہ یہ غلام و کنیز سے بہتر ہیں۔ آپ ﷺ نے مظلومیت کے دن بھی گزارے جن میں ہر دَور کے مظلومین کے لیے حوصلہ مندی اور ثابت قدمی کی تعلیم ہے' کیونکہ آپؐ نے اور آپ کے باصفا ساتھیوں نے نہایت صبر و ثبات کے ساتھ مکی زندگی میں ہونے والے مظالم کو برداشت کیا۔

پھر ایک وقت آیا کہ آپ ﷺ فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے جہاں سے آپؐ کو نکل جانے پر مجبور کر دیا گیا تھا' مگر اب بھی آپؐ جذبۂ شکر و امتنان کے ساتھ اپنے ربّ کے حضور سجدہ ریز تھے۔ آپؐ کی جان کے دشمن اور خون کے پیاسے جنہوں نے آپؐ کے ساتھ بدسلوکی کی انتہا کر دی تھی' آپؐ کے سامنے دست بستہ کھڑے تھے۔ آپؐ جس طرح چاہتے ان سے انتقام لے سکتے تھے مگر آپؐ نے فرمایا: ''جائو تمہیں معاف کیا' آج تم سے کوئی بدلہ نہیں لیا جائے گا''۔ بطورِ سپہ سالار آپؐ نے کئی عسکری مہمیں اختیار کیں مگر تاریخ گواہ ہے کہ کسی لڑائی کے موقع پر آپؐ نے نہ تو کسی بوڑھے'

بچے اور عورت پر ہاتھ اٹھانے دیا اور نہ ہی پرامن دشمن کو نشانہ بنایا' بلکہ مقابلہ پر آنے والے جنگجوئوں کے ساتھ ہی لڑائی کی اور فتح حاصل ہونے پر قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی وہ مثالیں قائم کیں کہ قیدیوں نے اس قید کو آزادی

پر ترجیح دی۔

آپؐ کرسی عدالت پر بیٹھنے والوں کے لیے بھی مثالی شخصیت تھے۔ آپؐ نے عدل و انصاف کے تقاضے پورے کرتے وقت اپنے پرائے' دوست دشمن' امیر غریب کی تفریق ختم کر دی۔ حسب' نسب اور جاہ و منصب کا بھی کوئی خیال نہ رکھا' بلکہ بے بس اور کمزور کو اس کا حق دلایا۔ صاحب جاہ و منصب کو دوسروں پر زیادتی سے روک دیا۔ جب بنی مخزوم قبیلے کی ایک عورت پر چوری ثابت ہوئی اور اس کو سزا سنائی گئی تو لوگوں نے آپؐ کے چہیتے حضرت اسامہؓ کو آپؐ کے پاس سفارش کے لیے آمادہ کر لیا۔ جب انہوں نے آپؐ کے سامنے مخزومی عورت کی سزا معاف کرنے کو کہا تو آپؐ نے فرمایا: ''اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا''۔

عبادت گزاروں کے لیے بھی آپؐ کے نقوش قدم راہنما تھے۔ آپؐ نے ہر جگہ عمل میں اعتدال کو اختیار کیا اور اُمت کے لیے پسند کیا۔ جن لوگوں نے ارادہ کیا کہ وہ گناہوں سے بچنے کی خاطر بیوی بچوں کے چکر میں پڑنے کی بجائے تجرد کی زندگی اختیار کریں گے' اسی طرح ساری ساری رات نمازیں پڑھیں گے اور ہمیشہ روزہ رکھیں گے تو آپؐ نے ان کو اس طرزِ عمل سے یہ کہہ کر روک دیا کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ نکاح میری سنت ہے' میں رات کو عبادت کے لیے جاگتا بھی ہوں' آرام بھی کرتا ہوں' نفل روزے رکھتا بھی ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں۔ ہر شخص پر اُس کے لیے اپنے نفس کا بھی حق ہے' اسے بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنے بھی ضروری ہیں اور معاشرے کے دوسرے افراد کا خیال بھی رکھنا ہے۔ گویا آپؐ نے زندگی بھرپور انداز میں بسر کرنے کا نمونہ چھوڑا ہے۔

سربراہِ خانہ کی حیثیت سے بھی آنحضور ﷺ کی زندگی مثالی ہے۔ آپؐ کی ازواجِ

مطہرات انتہائی عسرت کی زندگی میں بھی آپؐ سے خوش تھیں۔ آپ اپنی ازواجِ مطہرات' اولاد اور خادموں کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ ڈانٹنا ڈپٹنا آپؐ کے مزاج میں نہ تھا' بلکہ ہر فرد کے آپؐ کے حسنِ سلوک سے متأثر تھا۔

الغرض ہر شخص کے لیے آپ ﷺ کی زندگی مشعلِ راہ ہے۔ اسی لیے خالق کائنات نے {لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ} (بے شک رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے) فرما کر تمام انسانوں کو آپؐ کی پیروی کی ہدایت کی۔

بشریت

رسول اللہ ﷺ اولادِ آدم میں سے ایک فرد تھے۔ آپؐ مخلوق خدا میں سے اونچے مقام پر فائز تھے۔ آپؐ امام الانبیاء ہیں۔ تمام نبی انسان تھے اور انسان اشرف المخلوقات ہے۔ پس جو ہستی پوری کائنات میں اعلیٰ مقام پر ہو گی وہ بھی انسان ہی ہو گی۔ دوسرے انبیاء کی طرح انسانی کمزوریاں آپؐ کے ساتھ تھیں۔ آپؐ خوشی

کے موقعہ پر خوش ہوتے تھے ' ناخوشگوار صورت حال میں ناراض ہوتے تھے۔ لبھی لبھی آپؐ بیمار بھی ہوئے ہیں۔ آپؐ کو زخم آئے اور آپؐ نے درد کی اذیت محسوس کی۔ بھوک اورپیاس کی تکلیف بھی آپ محسوس کرتے تھے۔ دشمنوں کے مظالم' چیرہ دستیاں' طعن و تشنیع اور الزام تراشی آپؐ کے دل کو آزاردہ کرتی تھی۔ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی پیدائش پر آپؐ نے خوشی کا اظہار کیا اور اُن کی وفات پر آپؐ سخت غمگین ہوئے ہیں۔

ان ساری کیفیات اور داعیات کے باوجود آپؐ ہمیشہ مالک کی رضا پر راضی رہے ۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں کبھی کمی نہ کی۔ آپؐ کی اسی صفت کی وجہ سے آپؐ کی زندگی کو انسانوں کے لیے نمونہ اور قابل تقلید قرار دیا گیا' کیونکہ انسان کے علاوہ مخلوق کی کوئی دیگر نوع انسان کے لیے مثال نہیں بن سکتی۔ اگر کسی فرشتے کی زندگی کو انسانوں کے لیے نمونہ بنایا جاتا تو وہ اس کی پیروی کیسے کرتے۔ فرشتے کو نہ بیوی بچوں کی ضرورت' نہ کھانے پینے کی فکر۔ انسانوں کے لیے تو انسان ہی اُسوۂ حسنہ ہو سکتا

جس میں تمام انسانی کمزوریاں موجود ہیں مگر وہ انسانی کمزوریوں کو اپنے کردار و عمل پر منفی طور پر اثر انداز نہ ہونے دے' بلکہ اپنی زندگی کو ہمیشہ معیاری رکھے' تاکہ دوسرے لوگوں کو حوصہ ملے اور وہ بھی اچھا اور پسندیدہ رویہ اختیار کرنے کی کوشش کریں۔ قرآن کریم میں ایک سے زیادہ مرتبہ اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ تمام انبیاء انسان ہی تھے اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی انسان ہی تھے۔ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو آسمان سے کسی فرشتے ہی کو رسول بنا کر بھیجا جاتا۔ قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے :

{وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡۤا اِذۡ جَآءَہُمُ الۡہُدٰۤی اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَبَعَثَ اللّٰہُ بَشَرًا رَّسُوۡلًا ﴿۹۴﴾ قُلۡ لَّوۡ کَانَ فِی الۡاَرۡضِ مَلٰٓئِکَۃٌ یَّمۡشُوۡنَ مُطۡمَئِنِّیۡنَ لَنَزَّلۡنَا عَلَیۡہِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَکًا رَّسُوۡلًا ﴿۹۵﴾}(بنی اسراءیل)

''جب لوگوں کے پاس ہدایت پہنچ گئی تو انہیں ایمان لانے سے یہ بات مانع ہوئی کہ وہ کہنے لگے کہ کیا آدمی کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ (اے پیغمبر!) کہہ دیجیے : اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے اور آباد ہوتے تو ہم اُن پر آسمان سے کسی فرشتے کو ہی رسول بنا کر بھیجتے''۔

پھر سورۃ الکہف میں فرمایا :

{قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـہُکُمۡ اِلٰـہٌ وَّاحِدٌ}(الکہف:۱۱۰)

''(اے پیغمبر!) کہہ دیجیے میں تو ایک انسان ہوں تمہاری طرح' البتہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے''۔

اَخلاقِ نبویؐ

اسلامی تعلیمات میں اَخلاقیات کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اسلام بنی آدم کو صحیح معنوں میں انسان بنانا چاہتا ہے' تاکہ معاشرہ اچھے افراد سے بھر جائے' اَخلاقی خوبیاں عام ہوں اور معاشرہ امن و سلامتی کی تصویر بن جائے۔ مکارمِ اَخلاق سیرت و کردار کی بلندی کے مظہر ہوتے ہیں جبکہ دوسرے لوگ اُن سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ رسول پاک ﷺ سرتاپا اَخلاقی خوبیوں سے متصف تھے۔ یہ آپؐ کے سیرت و کردار کی بلندی ہی تھی جس نے اوّلین اہل مکہ کو متأثر کیا اور وہ آپ کو صادق اور امین کے لقب سے پکارنے لگے۔ جب آپؐ نے نبوت کا اعلان کیا تو وہی لوگ آپؐ کے شدید ترین مخالف ہو گئے۔ یہ مخالفت صرف آپؐ کے پیش کردہ نظام کی تھی جس میں بڑے چھوٹے کی تمیز ختم ہو رہی تھی۔ ورنہ نبی اکرم ﷺ کے سابقہ کردار پر کوئی کٹر سے کٹر مخالف بھی کبھی انگلی نہ اٹھا سکا۔

چالیس سال کی عمر میں رسول اکرم ﷺ پر نزولِ وحی کا آغاز ہوا تو آپؐ پیغامِ رسالت لوگوں تک پہنچانے لگے۔ اب آپؐ کی ہر بات خدا کی تعلیم کردہ تھی' جو کہ انتہائی صاف ستھری' مبنی بر انصاف اور معاشرے سے گندگی اور غلاظت کو ختم کرنے والی اور امن و سکون فراہم کرنے والی تھی۔ مگر آپؐ تو قبل از اعلانِ نبوت کی زندگی میں بھی اَخلاق و کردار کی انتہائی بلندیوں پر تھے۔ ایک شخص نے آپؐ کے ساتھ کوئی لین دین کا معاملہ کیا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ یہاں ٹھہریے میں ابھی آتا ہوں۔ آپؐ اس کے انتظار میں وہاں کھڑے ہو گئے۔ شاید وہ شخص جا کر بھول گیا اور واپس نہ آیا۔ تین دن کے بعد اتفاق سے اِدھر سے گزرا تو دیکھا آپؐ اسی جگہ کھڑے ہیں۔ وہ شخص شرمندہ ہوا' مگر آپؐ نے

صرف اتنا کہا کہ تمہاری وجہ سے مجھے بہت تکلیف اٹھانی پڑی ہے۔ یہ واقعہ اُس وقت کا ہے جب آپؐ پر ابھی نزولِ وحی کا آغاز نہیں ہوا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی عمر کے چالیس سال انتہائی سادگی کے ساتھ مکہ کے جاہلی معاشرے میں گزارے۔ وہاں ہر طرف اَخلاق باختہ عادات و اطوار کا ماحول تھا' مگر آپؐ نے اپنے دامن کو کسی ادنیٰ سی برائی سے بھی آلودہ نہ ہونے دیا۔ یہاں جس قدر بھی تعجب کیا جائے کم ہے کہ اہل مکہ آپؐ سے معجزہ کا مطالبہ کرتے رہے۔ کیا انہیں نظر نہیں آرہا تھا کہ آپؐ جیسا اَخلاق و کردار پورے ماحول میں کسی کا نہ تھا۔ کیا یہ معجزہ نہ تھا! اگر دین آبائی کی

زنجیریں اور اپنے مفادات کے طوق اُن کے لیے رکاوٹ نہ بنتے تو مکہ کا ہر شخص آپؐ کے اخلاق و کردار کی عظمت سے متأثر ہو کر اسلام قبول کر لیتا۔

رسول اللہ ﷺ رحمۃٌ للعالمین تھے۔ آپؐ نے بے کسوں کی دست گیری، بیوائوں کی خبر گیری اور یتیموں پر شفقت کرنے کا حکم دیا۔ آپؐ ،ضعیفوں اور کمزوروں کے کام آئے ۔ معذوروں اور محتاجوں کی ضروریات کا خیال رکھا۔ عدل و انصاف کے معاملے میں اپنے پرائے کا فرق ختم کر دیا۔ عورت کی عزت و وقار کو بلند کیا۔ مَردوں کو اس بات کی تلقین کی کہ وہ عورتوں کے حقوق کا خیال رکھیں۔ بچوں کے ساتھ محبت وپیار اور بڑوں کے لیے احترام کے جذبات رکھنے کی تعلیم دی۔ ہمسایوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے، بلکہ اُن کی خبر گیری کو ضروری ٹھہرایا اور فرمایا کہ جس شخص نے خود سیر ہو کر کھایا اور اُس کا ہمسایہ بھوکا سویا تو وہ ہم میں سے نہیں۔ ہمسائے کے حقوق پر اس قدر زور دیا کہ بقول صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ایسا معلوم ہونے لگا کہ شاید ہمسائے کو وراثت میں حصہ دار ٹھہرا دیا جائے گا۔ معاشرے میں امن و سکون کی بحالی کے لیے فرمایا کہ مؤمن تو حقیقت میں وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ یعنی نہ تو مسلمان کے ہاتھ کسی پر زیادتی کے لیے اٹھیں اور نہ ہی وہ زبان سے کسی کو ستائے ۔ کسی دوسرے کی چیز پر غاصبانہ قبضہ تو بہت دور کی بات ہے، بغیر اجازت کسی کی کوئی چیز استعمال کرنے سے بھی منع فرمایا۔ آپؐ نے تعلیم دی کہ اپنا کام خود کیا جائے اور حتی الوسع کسی دوسرے پر اپنے کام کا بوجھ نہ

ڈالا جائے۔ آپؐ نے تو جانوروں سے کام لینے کے بھی ضابطے بتادیے تاکہ اُن پر بھی کسی طرح کا ظلم نہ ہونے پائے۔ آپؐ نے تعلیم دی کہ اپنے جانوروں کوخوراک اُن کی ضرورت کے مطابق دو اور ان سے کام ان کی استطاعت کے مطابق لو۔ حلال جانور کا گوشت کھانا جائز ہے مگر جانور کے ذبح کرنے میں بھی آپؐ کی تعلیمات رأفت و رحمت کا مظہرہیں۔ جانور کو بھوکاپیاسا رکھ کر ذبح نہ کیا جائے۔ ذبح میں استعمال ہونے والی چھری کو پہلے سے تیز کر کے رکھا جائے تاکہ جانور کو کم سے کم تکلیف ہو۔ مذبوحہ کا جسم بے حرکت ہو جائے تو پھر اُس کی کھال کھینچی جائے، جبکہ اس معاشرے میں یہ رواج بھی تھا کہ زندہ جانور کے جسم سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ لیتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے ازدواجی زندگی کو تجرد کی زندگی پر ترجیح دی، بلکہ تجرد کی زندگی کو ناپسند فرمایا، کیونکہ یہ فطری تقاضوں کو فنا کرنے کے مترادف ہے۔ آپؐ نے بھرپور اور مصروف زندگی کو پسند کیا جس میں اللہ کے حقوق کے ساتھ ساتھ بندوں کے حقوق کی بھی پوری پوری پاسداری کی جائے۔ والدین پر لازم کیا کہ وہ اولاد کے حقوق کا خیال رکھیں اور اولاد کو والدین کے آرام اور سکھ کا خیال رکھنے کی تلقین کی۔ اس طرح آپؐ نے معاشرے کے کسی فرد کو بھی بے یارو مددگار اور unattended نہیں چھوڑا۔

رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین آپؐ کی صحبت میں بیٹھنے والے تھے۔ انہوں نے آپؐ کے اخلاق کو خود آنکھوں سے دیکھ کر بیان کیا ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ آپؐ کے غلام تھے۔ اُن کے والد اور کچھ رشتہ دار آپؐ کے پاس آئے اور زید کو آزاد کرنے کی اپیل کی۔ آپؐ نے فرمایا زید کو لے جائو۔ وہ زید کی طرف متوجہ ہوئے تو زید نے اُن کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں رہنے کو آزادی پر ترجیح دی۔ یہ آپؐ کے حسنِ اخلاق ہی کا نتیجہ تھا۔ ؎

محمدؐ کی غلامی ہے سند آزاد ہونے کی
خدا کے دامن توحید میں آباد ہونے کی

رسول اللہ ﷺ نے غلاموں کے ساتھ اچھے برتائو کی تعلیم دی۔ فرمایا جو خود کھائو وہ انہیں

کھلائو، جو خود پہنو انہیں بھی پہنائو۔ یہ کیسی غلامی ہے! اس پر تو واقعی آزادی قربان کی جا سکتی ہے۔ آپؐ نے ہر شخص کو ذمہ دار ٹھہرایا اور اسے ماتحتوں کے ساتھ نرمی اور عفو کا معاملہ کرنے کی تلقین کی۔ کسی حکمران اور مقتدر کو اپنے زیردستوں پر زیادتی کی اجازت نہ دی، بلکہ انہیں احساس دلایا کہ ہر وقت یاد رکھو کہ جس نے آج تمہیں اقتدار اور حکومت دی ہے وہ کل تم سے تمہارے اختیارات کے بارے میں ضرور پوچھے گا، لہٰذا ماتحتوں کے بارے میں آخرت کی جواب دہی کے لیے ہر وقت تیار رہو۔

الغرض زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں آپؐ نے تعلیم نہ دی ہو یا عملی نمونہ پیش نہ کیا ہو۔ آپؐ کے اخلاقِ حسنہ پر کئی کتابیں بھی لکھی جائیں تو موضوع کا حق ادا نہ ہو گا، مگر نصیحت حاصل کرنے کے لیے اشارات ہی کافی ہوتے ہیں۔ اخلاق کی یہ خوبیاں آپؐ کی شخصیت کا جزولاینفک تھیں، کیونکہ قرآن کی ساری الہامی تعلیمات پر آپؐ نے عمل کر کے دکھا دیا۔ بقول اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپؐ چلتا پھرتا قرآن تھے اور ایسا کیوں نہ ہو، آپؐ نے خود فرمایا ہے کہ مجھے اخلاقی خوبیوں کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔

ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ اُسوۂ حسنہ سے سبق سیکھے اور مسنون اخلاقی خوبیوں کو اپنانے کی طرف سنجیدگی سے دھیان دے۔

مساواتِ مرد و زن

مرد اور عورت اولادِ آدم کی دو اصناف ہیں۔ ہر صنف کی اپنی اہمیت ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔ تاہم شکل و شباہت' حقوق و فرائض اور دائرہ عمل میں دونوں کے درمیان واضح فرق ہے۔ عورت کو حسن ظاہری میں مرد سے زیادہ حصہ ملا ہے' نیز اس کی صوتی آہنگ میں نرمی اور ملائمت عیاں ہے۔ جبکہ مرد کو نسبتاً توانا' جفاکش اور مستحمل بنایا گیا ہے۔ الغرض عورت کی چال ڈھال' گفتگو اور اندازِ نشست و برخاست سے نسوانیت ٹپکتی ہے جبکہ مرد کی حرکات و سکنات اور کیفیات سے رجولیت مترشح ہوتی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی انفرادی خصوصیات ان کے اپنے اپنے دائرہ کار کے لیے انتہائی مفید اور ضروری ہیں۔

جس طرح کسی بھی دو چیزوں میں مساوات کا حکم لگانا آسان کام نہیں اسی طرح مرد وزن کے درمیان محض مساوات کا لفظ لگا دینا کافی نہیں بلکہ دونوں کے حقوق و فرائض اور دائرۂ کار کا تعین بھی ضروری ہے جس میں مساوات کا پہلو بھی سامنے آ جائے گا۔ مرد و عورت انسان ہونے اور مخصوص حقوق رکھنے کے ناطے تو بہرحال مساوی ہیں مگر یہ مساوات تو اپنی نوعیت میں اس قدر سادہ ہے کہ بہت سی مختلف چیزوں میں موجود ہے۔ مثلاً چرندے' پرندے اور درندے بھی ربّ کی مخلوق اور جاندار ہونے میں انسان کے مساوی ہیں۔ اگرچہ دائرۂ کار ہر کسی کا الگ الگ ہے اور جب دائرۂ کار کو زیر بحث لایا جائے گا تو مجموعی اعتبار سے انسان کی دوسرے جانداروں پر فضیلت سامنے آئے گی۔ لیکن ایک صنف کی دوسری اصناف پر فضیلت دوسری اصناف کی مخصوص اہمیت کو چنداں متأثر نہیں کرتی۔ اسی طرح جب مرد و عورت کے دائرۂ کار' عملی زندگی میں حقوق و فرائض اور وظیفہ ہائے زندگی کو زیر بحث لایا جائے گا تو مجموعی طور پر مرد کی عورت پر فضیلت ثابت

ہو گی مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہ ہو گا کہ صنف نازک کو غیر اہم قرار دے دیا جائے۔

ماحول پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں پولیس کے اہلکار' فوجی جوان' کالج کے اساتذہ' انتظامیہ کے افسران' محکمہ ڈاک اور ٹیلی فون کے ملازمین نظر آئیں گے۔ ان میں اس اعتبار سے تو مساوات ہے کہ یہ سب حکومت کے کارندے ہیں مگر فرائض کی نوعیت اور اختیارات کی کمی بیشی ان کے درمیان مساوات کا حکم لگانے میں سراسر مانع ہے' اگرچہ اہمیت ہر گروہ کی مسلمہ ہے۔

مرد کی اپنی اہمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے چند مخصوص فرائض کی انجام دہی کے لیے بنایا ہے اور اس کی تخلیق میں طاقت اور شجاعت جیسی صلاحیتیں رکھی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ دفاعِ وطن یا عزت و ناموس کی حفاظت کی خاطر ہمیشہ مردوں نے ہی اپنی جان جوکھوں میں ڈالی اور میدانِ کارزار میں متصادم ہوئے۔ اسی طرح

جسمانی مشقت کے کام ہمیشہ سے مرد ہی کرتے چلے آئے ہیں، مگر عورت کی اپنی اہمیت ہے کہ امورِ خانہ داری میں حسن ترتیب اور سلیقے کے ساتھ نہ صرف وہ مرد کو عظیم الشان کاموں کے لیے تیار کرتی ہے بلکہ نئی نسل کے ذکور واناث کی صلاحیتیں اسی کی گود میں نشوونما پاتی ہیں۔

اسلام منظم اجتماعی زندگی پر یقین رکھتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق چند افراد مل کر سفر کریں تو انہیں اپنے میں سے ایک کو امیر مقرر کر لینا چاہیے۔ پس خاندان کے نظام کو منظم رکھنے کے لیے صاحبِ خانہ مرد کو سربراہی سونپی گئی ہے(۱) اور مرد و زن دونوں کو فیصلہ خوش دلی کے ساتھ قبول کرنا چاہیے کہ یہ ربّ العالمین کی مشیت ہے۔ ہم یہاں قرآن و حدیث کی روشنی میں مرد و زن کی امتیازی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہیں جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ مرد زن میں مساوات کس درجہ کی ہے۔

۱) قرآن پاک میں اوامر و نواہی کے مخاطب عام طور پر مرد ہی ہیں جبکہ تبعاً وہی احکام عورتوں کے لیے بھی ہیں۔ ایسا نہیں ہوا کہ مخاطب عورتیں ہوں اور تبعاً مرد بھی ان میں شامل ہوں۔(۲

۲) قرآن پاک میں واضح طور پر مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فضیلت دی گئی ہے۔

سورۃ البقرہ آیت ۲۲۸ میں ہے: ''عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسی اُن پر ذمہ داریاہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ (فضیلت) حاصل ہے''۔

۳) نکاح مرد و عورت کے درمیان ایک معاہدہ ہے جس میں بااختیار فریق مرد کو بنایا گیا ہے۔ نکاح کی ڈور بلااستثناء(exclusively)مرد کے ہاتھ میں ہے یعنی مرد کو یہ قانونی اختیار ہے کہ وہ جس وقت چاہے عورت کو طلاق دے کر الگ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر عورت اپنے خاوند سے علیحدگی چاہے تو اس کو عدالت میں اپنی مظلومیت ثابت کرنا ہوگی۔(۳)

۴) اسلامی قانونِ شہادت میں دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر سمجھا گیا ہے۔(۴)

۵) اسلامی قانونِ وراثت میں لڑکے کو لڑکی سے دوگنا حصہ ملتا ہے۔(۵)

٦) عورتوں کا گھروں میں بیٹھنا اور چار دیواری کے اندر کے امور انجام دینا پسندیدہ ہے جبکہ مرد کو روزی کی تلاش میں بیرونِ خانہ کی سرگرمیوں کا مکلف ٹھہرایا گیا ہے۔(٦)

۷) عورت کی نماز مسجد کی نسبت گھر میں پڑھنا پسندیدہ اور افضل ہے اور برآمدے کی نسبت کمرے کے اندر پڑھنا بہتر ہے جبکہ مرد کے لیے لازم ہے کہ وہ مسجد میں جا کر پنج گانہ نماز ادا کرے۔(۷)

۸) مرد کو منتظم خانہ ہونے کے ناطے اپنی عورت کو تادیبی سزا دینے کی اجازت ہے جبکہ عورت اپنے مرد کی اصلاح کے لیے اسے جسمانی سزا نہیں دے سکتی۔ قرآن کریم میں ہے: ''اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو

انہیں سمجھائو' خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو اور مارو۔ پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لیے بہانے تلاش نہ کرو''۔ (النساء:۳۴)

۹) عورت کا نان و نفقہ اور رہائش کی سہولت مرد کی ذمہ داری ہے۔ عورت پر یہ

ذمہ داری نہیں کہ وہ افراد خانہ کے قیام و طعام کا بندوبست کرے۔ (النساء:۳۴)

۱۰) میدانِ جنگ میں جہاد و قتال مردوں کی ذمہ داری ہے اور عورتیں اس سے کلیتاً مستثنیٰ ہیں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ عورتیں جسمانی کمزوری کے سبب جنگ و جدال' نیزہ اور تیر و تفنگ اٹھانے کے قابل نہیں۔

۱۱) نبوت اور رسالت اللہ تعالیٰ نے صرف مردوں میں رکھی ہے' کسی عورت کو یہ منصب نہیں عطا ہوا۔ اس حقیقت پر تاریخِ انسانیت شاہد ہے۔ البتہ یہ حقیقت اپنی جگہ تسلیم کہ انبیاء و رسل نے عورتوں کے ہاں ہی جنم لیا۔

۱۲) نماز باجماعت میں امامت صرف مرد ہی کی ذمہ داری ہے۔ عورت نماز باجماعت میں آگے کھڑی ہو کر امامت نہیں کر سکتی۔ البتہ اگر عورتیں ہی عورتیں مل کر نماز پڑھ رہی ہوں تو اگلی صف کے درمیان کھڑی عورت ان کی امامت کر سکتی ہے' مگر وہ بھی صف سے آگے نکل کر اکیلی کھڑی نہیں ہو گی۔(۸)

۱۳) نماز جمعہ اور عیدین چونکہ گھر سے باہر نکل کر ادا کرنا ہوتی ہیں اس لیے عورتوں پر رض نہیں۔ صرف مردوں پر فرض ہیں۔(۹)

۱۴) مردوں کے لیے صرف ستر کے احکام ہیں جبکہ عورتوں کے لیے ستر کے علاوہ حجاب (پردہ) کے احکام بھی ہیں۔ وہ مردوں کی طرح بلاتکلف گھر سے باہر نہیں نکل سکتیں۔(۱۰)

۱۵) شادی شدہ عورت کو قرآن میں محصنہ کہا گیا ہے یعنی جو کسی مرد کے زیرِ حفاظت آچکی ہو۔ گویا مرد عورت کو حفاظت(Protection)دینے والا ہے۔(۱۱)

۱۶) ایک مرد ایک ہی وقت میں چار عورتوں کو نکاح میں رکھ سکتا ہے جبکہ ایک عورت کو اجازت نہیں کہ وہ بیک وقت کئی مردوں سے نکاح کر سکے۔(۱۲)

۱۷) حج ارکانِ اسلام میں سے ہے۔مرد کو استطاعت ہو تو جب چاہے سفرِ حج اختیار کر سکتا ہے۔ مگر عورت استطاعت کے باوجود حج کا سفر اختیار نہیں کر سکتی جب تک

کوئی محرم مرد اس کے ساتھ جانے والا نہ ہو۔(۱۳)

۱۸) مرد جب چاہے نفلی روزہ رکھ لے۔مگر شادی شدہ عورت اپنے موجود شوہر کی اجازت سے ہی نفلی روزہ رکھ سکتی ہے۔(۱۴)

۱۹) رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ''اللہ کے سوا کسی کو سجدہ روا نہیں۔ اگر خدا کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورتوں کو کہتا کہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں''۔ (۱۵)

۲۰) جس عورت کو طلاق ہو جائے یا اس کا شوہر فوت ہو جائے تو وہ عدت کی مدت گزار کر ہی دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی ہے، مگر کسی مرد کی بیوی فوت ہو جائے یا وہ اسے طلاق دے دے تو وہ بلا انتظار کسی دوسری عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔(۱۶)

۲۱) نماز جنازہ صرف مردوں پر فرض ہے، عورتوں پر نہیں۔ یہ بھی اس لیے کہ عورتوں کا گھروں سے باہر نکلنا پسندیدہ نہیں۔(۱۷)

مذکورہ بالا شواہد سے مرد اور عورت کے دائرہ ہائے کار اور حقوق و فرائض کا تعین چنداں مشکل نہیں رہا۔ رہا یہ سوال کہ جدید دور ہے اور اس کے جدید تقاضے ہیں، اس میں آبادی کے نصف حصے کو گھر کی چار دیواری میں پابند رکھنا مناسب نہیں جبکہ عورت نے وہ تمام کام کر دکھائے ہیں جو مرد کرتا ہے تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مندرجہ بالا شواہد اسلامی تعلیمات پر مبنی ہیں جن کے اصول خود خالقِ کائنات نے وضع کیے ہیں، وہ ہر دور کے تقاضے جانتا ہے، اس لیے یہ اعتراض سرے سے غلط ہے کہ اسلامی تعلیمات جدید تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ انسانی ذہن خالقِ فطرت کے وضع کردہ قوانین کو از خود غلط سمجھ بیٹھے مگر ایسا انسان بھی راہِ گم گشتہ کی کیفیت سے نکل کر اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گا کہ خالقِ کائنات کے دیے ہوئے قوانین ہی بہترین ہیں۔ عورت کے حقوق و فرائض کے تعین میں افراط و تفریط کا یہ نیا تجربہ نہیں بلکہ اس سے قبل یہ کئی مرتبہ آزمایا گیا ہے کہ مگر ہر دفعہ نتائج بد سے بدتر نکلے۔ آج بھی مغرب میں مخلوط معاشرے کا رواج اور عورت پر بیرونِ خانہ کی ذمہ داریاں ڈال کر خاندانی زندگی کو تہہ و

بالا کر دیا گیا ہے اور نتیجتاً یہ یورپی دانشور اپنی غلطی تسلیم کر رہے ہیں اور زبانِ حال سے پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مرد و عورت کے وہی حقوق و فرائض جو اسلام نے پیش کیے ہیں متوازن، معتدل اور اقرب الی الفطرت ہیں۔ مشہور فرانسیسی دانشور روسو نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''عمرانی معاہدہ''(Social Contract) میں لکھا ہے:

''یہ عورت کے رول میں ہے کہ وہ گھر میں رہے، گھر کو درست رکھے، بچوں کی نگہداشت کرے، گھر کے مردوں کو اس قسم کی تعلیم دے کہ وہ اچھے شہری بن سکیں، مگر عورت کو اس میدان میں خود کبھی دخل نہیں دینا چاہیے''۔

نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر ایلیکس کیرل نے اپنی مشہور کتاب ''انسان نادریافت'' میں لکھا ہے:

''عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو خود اپنی فطرت کے مطابق ترقی دیں اور مردوں کو نقل کرنے کی

کوشش نہ کریں۔ تہذیب کی ترقی میں ان کا حصہ اس سے زیادہ ہے جتنا مردوں کا ہے۔ ان کو اپنے مخصوص عمل کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

زمانہ قدیم سے عورت کی حیثیت' مقام اور حقوق و فرائض کے تعین میں افراط و تفریط رہی۔ ہر دفعہ نتیجہ یہی نکلا کہ عورت کی سرگرمیاں گھریلو نوعیت کی ہیں' اسے مردوں کے شانہ بشانہ بیرونِ خانہ کے پر مشقت کاموں میں الجھانا ہمیشہ انتشار و فساد کا باعث ہوا۔ مشہور یونانی فلسفی ارسطو (جس کی وفات ۳۲۲ قبل مسیح میں ہوئی) نے اپنی کتاب ''سیاسیات'' میں لکھا ہے:

''سیاست میں عورت کا کوئی رول نہیں ہے۔ اس کا ان فیصلوں میں کوئی ہاتھ نہیں ہونا چاہیے جو خاندان سے باہر خلقِ خدا کی بہترین کے لیے کیے جاتے ہیں''۔

آج اگرچند عورتوں نے بیرونِ خانہ کے وہ کام جو مردوں کے شایانِ شان ہیں کر دکھائے ہیں تو اس میں چنداں تعجب کی بات نہیں۔ عورتوں کی ایک قلیل تعداد میں غیر معمولی صلاحیتوں کا پایا جانا مستثنیات میں شمار ہوتا ہے اور مستثنیات کو عموم کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے برعکس عورتوں کی اس کارکردگی نے جو منفی اثرات پیدا کیے ہیں وہ کہیں زیادہ ہیں۔ مغربی معاشرے میں جہاں عورتوں کو کھلے بندوں مردوں کے ساتھ مسابقت

(compete) کرنے) کے مواقع ہیں وہاں بھی جن عورتوں کی کارکردگی عمدہ قرار دی جا سکتی ہے ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ سائنس کا نوبل پرائز پانے والے ۲۷۸ افراد میں سے صرف چھ عورتیں ہیں۔ امریکہ میں سب سے بڑے سائنسی ادارے نیشنل اکڈمی آف سائنس کے منتخب ممبران میں عورتوں کی تعداد ڈیڑھ فیصد سے زیادہ نہیں اور تو اور کسی ترقی یافتہ ملک میں بھی زچگی کی ماہرین ڈاکٹر خواتین کی تعداد بھی اس ملک کی ضرورت کے مطابق نہیں بلکہ مرد ماہر ڈاکٹروں کو یہ کام بھی کرنا پڑتا ہے۔

اگر ان تمام تصریحات کے باوجود کوئی شخص اس بات پر مصر ہو کہ مرد اور عورت میں کامل مساوات اور برابر کی صلاحیتیں ہیں اور عورتوں کو بیرونِ خانہ کے پر مشقت کاموں میں مرد کے شانہ بشانہ کام کرنا چاہیے تو یہ اس کی خود فریبی ہے یا پھر اسے ذہنی اور فکری انتشار کا عارضہ لاحق ہے۔

حواشی

(۱) ''مرد عورتوں پر قوام (حکمران و نگران) ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں''۔ (النساء:۳۴)

(۲) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کیے گئے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تاکہ تم پرہیزگار بنو'' (البقرۃ:۱۸۳) اور اس طرح کی بے شمار آیات۔

(۳) البقرۃ:۱۳۵، ۱۳۶۔

(۴) ''... اور اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرا لو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے''۔ (البقرۃ:۲۸۲)

(۵) ''تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے''۔ (النساء)

(٦) ''اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو''۔ (الاحزاب:۳۳)

(۷) ''عورت کا اپنی کوٹھڑی میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنے کمرے میں نماز پڑھے اور اس کا اپنے اندرونی کمرے میں نماز پڑھنا بیرونی کمرہ میں پڑھنے سے بہتر ہے''۔ (ابوداؤد عن ابن مسعودؓ)

(۸) سنن ابی داؤد۔ دار قطنی۔ بیہقی۔

---

(۹) سنن ابی داؤد، عن طارق بن شہاب۔

(۱۰) الاحزاب:۵۹۔

(۱۱) النساء:۲۴۔

(۱۲) النساء:۳۔

(۱۳) ترمذی۔ سنن ابی داؤد، عن ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ۔

(۱۴) معارف الحدیث، جلد چہارم، ص ۲۹۴۔

(۱۵) البقرۃ:۲۲۸، ۲۳۴۔

(۱٦) بخاری عن اُم عطیہ۔

عورت کا دائرہ کار

عورت عربی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہے پردہ میں رہنے کی چیز۔ وہ شے جو چھپانے کے قابل ہو اور اس کا نظروں کے سامنے آنا طبعاً ناپسندیدہ اور ناگوار ہو۔ اسی لیے یہ لفظ انسان کے ان اعضاء کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو ہمیشہ چھپائے جاتے ہیں۔عربی زبان میں لفظ عورت مرد (رَجُل) کی مؤنث کے لیے نہیں بولا جاتا۔ البتہ اردو زبان میں یہ لفظ زن (Woman)کے معنوں میں مستعمل ہے اور یہ لفظ حوا کی بیٹی کے لیے اسی لیے اختیار کیا گیا ہے کہ وہ ہمہ تن چھپانے کی چیز ہے۔ زن کے لیے فارسی میں لفظ مستور استعمال کیا جاتا ہے جس کی جمع مستورات ہے جو اردو میں عام مستعمل ہے۔ مستور کا معنی بھی بالکل وہی ہے جو عورت کا معنی عربی زبان میں اوپر مذکور ہوا یعنی چھپی ہوئی چیز۔

جس شخص نے اسلامی لٹریچر کا تھوڑا بہت بھی مطالعہ کیا ہو گا اس پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ عورتوں کا اصل مقام ان کا گھر ہے جہاں ان پر غیر محرم افراد کی نظر نہیں پڑ سکتی۔ حدیث نبویؐ کے الفاظ ہیں: ((اَلْمَرْءَ ۃُ عَوْرَۃٌ)) یعنی عورت چھپائے جانے کے لائق ہے۔ نیز دوپٹہ کے لیے قرآن شریف میں لفظ ”خمار“ استعمال ہوا ہے جس کا لفظی معنی ہے چھپانے والی چیز۔ عورت گھر سے باہر نکلے تو پردے کے لیے جلباب اوڑھ کر نکلے۔ لفظ جلباب قرآن شریف میں مذکور ہے اور اس کا معنی ہے وہ بڑی چادر جو اصل لباس کو بھی ڈھانپ لے‘ تو گویا قرآن و حدیث کی ان تصریحات کے مطابق عورت لاریب وہ ہے جو پردہ نشین اور ستر و حجاب کی پابندی کرنے والی ہے۔

مسلمانوں کی زندگی میں مخلوط معاشرے کا کوئی تصور نہیں۔ یہاں مرد روزی کمانے کے لیے گھر سے باہر بھاری اور پر مشقت کام کرتا ہے جبکہ عورت گھر کے اندر ہلکے پھلکے

کام کرنے کی ذمہ دار ہے۔ عورتوں کے فرائض منصبی گھر کی چاردیواری کے اندر تک محدود ہیں۔ ان کا کام مردوں کے لیے گھر کے اندر پرسکون ماحول کی فراہمی اور اولاد کی صحیح خطوط پر تربیت کرتا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ

ازواجِ مطہرات1 کو خطاب فرماتا ہے:

{وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰى} (الاحزاب:۳۳)

''اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دورِ جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو''۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے رسول پاک ﷺ کا ارشاد ترمذی شریف میں اس طرح نقل ہوا ہے:

''عورت مستور رہنے کے قابل شے ہے' جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو تاکتا ہے اور وہ اس وقت اللہ کی رحمت سے قریب ہوتی ہے جبکہ وہ اپنے گھر کے اندرونی حصہ میں ہو''۔

چنانچہ عورتوں کو ان کاموں کا مکلف ہی نہیں ٹھہرایا گیا جن کا تعلق گھر سے باہر کی دوڑ دھوپ سے ہو۔ یہاں تک کہ عورتوں کو جہاد پر جانے سے روک دیا گیا ہے۔ حافظ ابوبکر بزار حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ عورتوں نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ ساری فضیلتیں تو مرد لوٹ کر لے گئے۔ وہ جہاد کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں بڑے بڑے کام کرتے ہیں' ہم کیا عمل کریں کہ ہمیں بھی مجاہدین کے برابر اجر مل سکے۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا: ''جو تم میں سے گھر بیٹھے گی وہ مجاہدین کے عمل کو پالے گی''۔ مطلب یہ ہے کہ خاتون خانہ اپنے مرد کو اطمینان کے ساتھ جہاد پر جانے کا موقع دے گی اور اسے اپنے گھر کی طرف سے پورا اطمینان ہو گا کہ اس کی بیوی اس کے گھر اور بچوں کو سنبھالے بیٹھی رہے گی اور اس کی عدم موجودگی میں کوئی گل نہیں کھلائے گی۔

جہاد تو بڑی دور کی بات ہے مسلمان عورتوں کو تو جمعہ کی نماز سے بھی مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے کیونکہ یہ نماز گھر سے نکل کر صرف مسجد ہی میں ادا ہو سکتی ہے۔ حالانکہ

نمازِ جمعہ وہ نماز ہے جس کے ادا کرنے کی مردوں کو سخت تاکید کی گئی ہے۔ ایک موقعہ پر رسول پاک ﷺ نے رمایا: ''میں چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کے گھروں کو آگ لگا دوں جو بلاعذر جمعہ کی نماز کے لیے مسجد میں نہیں آتے''۔ مردوں کے لیے روزانہ کی نماز پنج گانہ بھی محل کی مسجد میں پابندیٔ وقت کے ساتھ جماعت کی صورت میں ادا کرنا فرض قرار دیا گیا ہے جبکہ عورت کو پانچوں نمازیں گھر پر ادا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ احمد اور طبرانی میں مذکور ہے کہ اُم حمید ساعدیہؓ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ مجھے آپؐ کے پیچھے نماز پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''تمہارا اپنے کمرے میں نماز پڑھنا برآمدے میں پڑھنے سے بہتر ہے اور تمہارا اپنے گھر میں نماز پڑھنا اپنے محلے کی مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے اور تمہارا اپنے محلے کی مسجد میں نماز جمعہ پڑھنا جامع مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے''۔ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں جو احمد اور طبرانی میں ہے آنحضور ﷺ کے الفاظ یہ

ہیں:

((خَیْرُ مَسَاجِدِ النِّسَایِ قَعْرُ بُیُوْتِھِنَّ))

''عورتوں کے لیے بہترین مسجدیں ان کے گھروں کے اندرونی حصے ہیں''۔

چونکہ عورت کا دائرہ کار اور اس کی سرگرمیاں گھر کی چار دیواری کے اندر تک محدود ہیں اس لیے بیرون خانہ کے کاموں کی ذمہ داری اس پر ڈالی ہی نہیں گئی۔ اس کے جملہ اخراجات اور ضروریات کی کالت مرد کے ذمہ ہے۔ قرآن پاک میں جہاں مردوں کی عورتوں پر ایک گونہ فضیلت کا ذکر ہے وہاں اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ (مرد) ان پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں یعنی ان کی کفالت کے ذمہ دار ہیں۔ گویا عورت کو معاشی ذمہ داریوں سے آزاد رکھا گیا ہے۔

عورت سرتاپا چھپانے کی چیز ہے' یہاں تک کہ اس کی آواز بھی غیر محرم مردوں کے کانوں تک نہیں پہنچنی چاہیے اور اگر کبھی ایسا ضروری ہو جائے تو قرآن پاک میں تعلیم (بحوالہ آیت ۳۲ سورۃ الاحزاب) یہ ہے کہ ایسے موقع پر عورت کا لہجہ اور اندازِ گفتگو غیر ملائم اور بھاری سا ہونا چاہیے تاکہ مخاطب کو نہ تو آواز میں دلکشی اور نسوانیت محسوس ہو اور

نہ اسے کسی طرح کے لالچ کی راہ نظر آئے۔ اسی بنا پر عورت کے لیے اذان دینا ممنوع ہے۔ بلکہ اگر کبھی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ نماز باجماعت میں پیچھے کوئی عورت بھی موجود ہو اور امام غلطی کرے تو مرد کی طرح اسے سبحان اللہ کہنے کی اجازت نہیں بلکہ اسے ہاتھ پر ہاتھ مار کر آواز پیدا کرنی چاہیے تاکہ امام متنبہ ہو جائے۔

سورۃ النور کی آیت ۳۱ میں مسلمان عورتوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنے پائوں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہے اس کا لوگوں کو علم ہوجائے ۔ مزید یہ کہ اگر اشد ضرورت کے تحت عورت کو گھر سے باہر نکلنا ہو تو زیورات کی جھنکار کے اظہار کی بھی اسے ممانعت ہے اور خوشبو لگانے سے بھی روکا گیا ہے۔

سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۹ کی تفسیر میں امام ابن کثیر رحمہ اللہ علیہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمان عورتوں کو حکم دیتا ہے کہ جب وہ اپنے کسی کام کے لیے گھر سے باہر نکلیں تو جلباب اوڑھ کر اپنا چہرہ ڈھانپ لیں اور جلباب کا معنی اوپر مذکور ہوا یعنی وہ چادر جو جسم پر اس طرح لپیٹ لی جاتی ہے کہ اس سے لباس بھی چھپ جاتا ہے۔

مذکورہ بالا توضیحات سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق عورت کا دائرہ کار گھر کے اندر تک محدود ہے اور اگر اسے ناگزیر حالات میں گھر سے باہر جانا پڑے تو اسے ایک بڑی چادر سے اپنے جسم بلکہ کپڑوں تک کو ڈھانپ کر نکلنا چاہیے۔ تاریخِ اسلام کا مطالعہ کرنے والوں پر یہ چیز مخفی نہیں کہ عہدِ

رسالت مآبؐ اور دورِ خلافت راشدہ میں مسلمان عورتیں منشائے اسلام کے مطابق پردے کی سخت پابندی کرتی تھیں۔ البتہ چند واقعات ایسے بھی ملتے ہیں جن سے اگرچہ کسی کی غلط ہمی پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں تاہم کج رو اور زیغ پسند طبائع ان سے فائدہ اٹھانے کی ناکام کوشش کر سکتے ہیں' چنانچہ یہاں ان کا تذکرہ کر دینا بھی بات کو مزید واضح کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں معاشی جدوجہد کی مثال ملتی ہے مگر

اوّل تو یہ ان کے رسول پاکؐ کی زوجیت میں آنے اور قبولِ اسلام سے پہلے کی بات ہے لہٰذا یہ حجت نہیں' دوم یہ کہ وہ معاشی جدوجہد گھر کے اندر بیٹھ کر کرتی تھیں اور خود باہر نہیں گھومتی تھیں۔ سوم یہ اس وقت کا ذکر ہے جب ان کے شوہر فوت ہو چکے تھے اور ان کی کالت کرنے والا کوئی نہیں تھا مگر جب وہ آنحضرت ﷺ کی زوجیت میں آئیں تو اب کالر کی ذمہ داری آپؐ نے لے لی اور اُم المؤمنینؓ نے معاشی جدوجہد ترک کر دی۔ اسی طرح ازواجِ مطہرات1اور صحابیاتؓ میں شاید ہی کوئی عورت ہو جو معاشی جدوجہد میں مصروف نظر آتی ہو۔

(۲) جنگ بدر میں چند صحابیات نے میدانِ جنگ میں زخمیوں کی مرہم پٹی کی تو سمجھ لینا چاہیے کہ اوّل تو جنگ بدر کا یہ واقعہ سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب (جن میں پردے کے احکام نازل ہوئے) کے نزول سے پہلے کا واقعہ ہے لہٰذا حجت نہیں۔ دوسرے یہ صورت بھی اضطراری تھی کیونکہ یہ کفر و اسلام کے درمیان پہلی جنگ تھی اور مسلمانوں کے لیے تخت یا تختہ والا معاملہ تھا۔ تیسرے یہ کہ بعد کے کسی غزوے میں عورتوں کا اس طرح میدانِ جنگ میں کام کرنا ثابت نہیں بلکہ بعد کی ایک جنگ کے موقعہ پر کچھ عورتیں اس مقصد کے لیے گھروں سے نکلیں' آنحضور ﷺ کو معلوم ہوا تو آپؐ نے ناگواری کا اظہار کیا اور انہیں واپس گھروں کو بھیج دیا اور پھر کبھی مسلمان عورتوں کو میدانِ جنگ میں نہ جانے دیا۔

(۳) جنگ جُمل میں حضرت عائشہ الصدیقہ رضی اللہ عنہا نے بذاتِ خود حصہ لیا مگر معلوم ہونا چاہیے کہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیال اس بارے میں کیا تھا۔ عبداللہ ابنِ احمد بن حنبلؒ نے زوائد الزھد میں اور ابن المنذر' ابن ابی شیبہ اور ابن سعد نے اپنی کتابوں میں مسروق رحمہ اللہ علیہ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے اس آیت وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ ... الخ پر پہنچتی تھیں تو بے اختیار رو پڑتی تھیں یہاں تک کہ ان کا دوپٹہ بھیگ جاتا تھا کیونکہ انہیں اس پر وہ غلطی یاد آجایا کرتی تھی جو ان سے جنگ جمل میں ہوئی تھیں۔

(۴) عورت کے لیے ستر و حجاب کی یہ پابندی فحاشی اور زناکاری کی روک تھام کے لیے تھی مگر اس کے باوجود عہدِ رسالت مآبؐ میں زنا کے اِکا دُکا واقعات پیش آئے اور مجرموں کو سزا بھی دی گئی تو اس میں تو کوئی شک نہیں کہ رسالت مآبؐ کے پاکیزہ عہدمیں ستر و حجاب کی پابندی کے نتیجہ میں نہایت مطہر معاشرہ قائم ہو چکا تھا مگر جاننا چاہیے کہ وہ لوگ بھی آخر انسان ہی تھے اور انسانوں کا معاشرہ جرائم سے قطعی پاک نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ واقعات پیش نہ آتے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مجرموں پر حد جاری نہ کرتے تو بعد میں اعتراض ہو سکتا تھا کہ قذف و زنا کی اتنی سخت سزا نظری طور پر تودرست ہو سکتی ہے مگر اس پر عمل درآمد ممکن نہیں اور ناممکن کا حکم حکمت کے خلاف ہے۔ چنانچہ عہدِرسالت میں قذف و زنا کے مجرموں کو سزا دے کر حدود پر عمل درآمد کی مثال قائم کر دی گئی۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ گھر عورت کے لیے قید خانہ نہیں بنایا گیا بلکہ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا ضرورت کے تحت وہ بڑی چادر اوڑھ کر باہر نکل سکتی ہے' لہٰذا گھر کے باہر کی تمام ناگزیر سرگرمیوں میں وہ حصہ لے سکتی ہے۔ بچیاں سکول جائیں' خواتین انہیں پڑھانے کے لیے تعلیمی اداروں کی طرف چل کر جائیں۔ طالبات طب کی تعلیم حاصل کر کے زنانہ ہسپتالوں میں ملازمت اختیار کریں یا اپنے کلینک کھول لیں وغیرہ۔ مگر ان ناگزیر صورتوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے نوجوان لڑکیوں کو بینک' ڈاک خانے اور دوسرے دفاتر میں حسن و زیبائش کی نمائش کرتے ہوئے مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کی اجازت دینا ہرگز ہرگز قرین انصاف نہیں۔ پھر ہمارے ہاں تو مرد جو بنیادی طور پر کفیل خانہ ہیں ہر قسم کی صلاحیت اور تعلیم کے باوجود تلاشِ روزگار میں پریشان اور سرگرداں ہیں اور اس صورتِ حال نے تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیا ہے اور یہ ہونہار نوجوان جرائم کا راستہ اختیار کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پا رہے ہیں۔ ایسے میں اگر مردوں کو نظر انداز کر کے عورتوں کو ملازمتیں دی جائیں تو اس

سے اچھے نتائج کی توقع قطعاً کارِ عبث ہے۔

خلّاقِ کون و مکان نے حسن و جمال میں عورت کو وافر حصہ عطا کیا ہے اور وہ فطرتاً خوبصورت نظر آنا چاہتی ہے۔ قدرت نے جس حکمت کے تحت عورت میں یہ دلکشی رکھی ہے وہ کسی صاحب ِ بصیرت سے مخفی نہیں۔ چنانچہ اس جذبے کی تسکین کے لیے اسلام میں عورت کو زیورات پہننے' سجاوٹ کرنے اور جسمانی زینت و آرائش اختیار کرنے کی اجازت دی ہے مگر اس زیب و زینت کا اظہار گھر کی چار دیواری کے اندر صرف شوہر کے سامنے جائز ہے اور ان افرادِ خانہ کے سامنے جو اس کے محرم ہیں یعنی جن کے ساتھ اس کا نکاح کسی حال میں نہیں ہو سکتا مثلاً باپ' بھائی' بیٹا' چچا وغیرہ۔ اس طرح عورت کے فطری جذبہ کی تسکین بھی ہو جاتی ہے اور کسی فتنے کا بھی کوئی امکان نہیں رہتا۔ مگر عورت کا پوری دلکشی اور رعنائی کے ساتھ نیم عریاں لباس' ننگے سر' سراپا نمائش گھر

سے نکلنا اسلامی معاشرے میں کسی طرح فٹ نہیں بیٹھتا۔ اسلام تو اس انداز کو جاہلیت کی سج دھج قرار دیتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۲ کے تحت دور جدید کے مفسر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

''... اب یہ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ جو دین عورت کو غیر مرد سے بات کرتے ہوئے بھی لوچدار اندازِ گفتگو اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اسے مردوں کے سامنے بلا ضرورت آواز نکالنے سے بھی روکتا ہے کیا وہ کبھی اس کو پسند کر سکتا ہے کہ عورت سٹیج پر آکر گائے' ناچے' تھرکے' بھاؤ بتائے اور ناز و نخرے دکھائے؟ کیا وہ اس کی اجازت دے سکتا ہے کہ ریڈیو پر عورت عاشقانہ گیت گائے اور سریلے نغموں کے ساتھ فحش مضامین سنا سنا کر لوگوں کے جذبات میں آگ لگائے؟ کیا وہ اسے جائز رکھ سکتا ہے کہ عورتیں ڈراموں میں کبھی کسی کی بیوی اور کبھی کسی کی معشوقہ کا پارٹ ادا کریں؟ یا ہوائی میزبان (Air Hostess) بنائی جائیں اور انہیں خاص طور پر مسافروں کا دل لبھانے کی تربیت دی جائے؟ یا کلبوں اور اجتماعی تقریبات اور مخلوط مجالس میں بن ٹھن کر آئیں اور مردوں سے خوب گھل مل کر بات چیت اور ہنسی مذاق کریں؟ یہ کلچر آخر کس قرآن سے برآمد

کی گئی ہے؟ خدا کا نازل کردہ قرآن تو سب کے سامنے ہے اس میں کہیں اس کلچر کی گنجائش نظر آتی ہو تو اس مقام کی نشاندہی کر دی جائے ... اللہ تعالیٰ جس طرزِ عمل سے عورتوں کو روکنا چاہتا ہے وہ ان کا اپنے حسن کی نمائش کرتے ہوئے گھروں سے باہر نکلنا ہے۔ وہ ان کو ہدایت رماتا ہے کہ اپنے گھروں میں ٹک کر رہو کیونکہ تمہارا اصل کام گھر میں ہے نہ کہ اس کے باہر۔ لیکن اگر باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو اس شان کے ساتھ نہ نکلو جس کے ساتھ سابق دورِ جاہلیت میں عورتیں نکلا کرتی تھیں۔ بن ٹھن کر نکلنا' چہرے اور جسم کے حسن کو زیب و زینت اور چست لباسوں یا عریاں لباسوں سے نمایاں کرنا اور ناز و انداز سے چلنا ایک مسلم معاشرے کی عورتوں کا کام نہیں ہے۔ یہ جاہلیت کے طور طریقے ہیں جو اسلام میں نہیں چل سکتے۔ اب یہ بات ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ جو ثقافت ہمارے ہاں رائج کی جا رہی ہے وہ قرآن کی رو سے اسلام کی ثقافت ہے یا جاہلیت کی ثقافت۔ البتہ اگر کوئی اور قرآن ہمارے کارفرمائوں کے پاس آگیا ہے جس سے اسلام کی یہ روح نکال کر مسلمانوں میں پھیلائی جا رہی ہے تو دوسری بات ہے''۔ (تفہیم القرآن' جلد چہارم' ص ۸۹ تا ۹۲)

فاعتبروا یا اولی الابصار

بدعات کیوں قابل مذمت ہیں؟

اسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے۔ یہی اُس نے انسانوں کے لیے منتخب کیا ہے۔ جو کوئی بھی اسلام کے علاوہ کوئی اور طریقہ ٔ زندگی اختیار کرے گا تو وہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَ مَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ ۚ} (آل عمران:۸۵)

''اور جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ اُس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔''

وجہ اس کی یہ ہے کہ دین اسلام کے قواعد و ضوابط اور اوامر و نواہی خود انسان کے خالق نے بنائے ہیں اور خالق اپنے علم، قدرت، اختیار اور حکمت میں بے مثل و بے مثال ہے۔ اس کی تخلیق میں کسی طرح کا عیب یا نقص نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ خود ہر کمزوری اور عیب سے پاک ہے۔ اس نے جو ضابطہ ٔ حیات انسان کے لیے پسند کیا ہے وہ ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ اس بات کا اعلان خود اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے آخری ایام میں ان الفاظ کے ساتھ کر دیا تھا:

{اَلۡیَوۡمَ اَکۡمَلۡتُ لَکُمۡ دِیۡنَکُمۡ وَ اَتۡمَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ نِعۡمَتِیۡ وَ رَضِیۡتُ لَکُمُ الۡاِسۡلَامَ دِیۡنًا ؕ} (المائدۃ:۳)

''آج کے دن مَیں نے تمہارے لیے تمہارا دین (ضابطہ ٔ حیات) مکمل کر دیا، اور تمہارے اوپر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطورِ دین پسند کر لیا''۔

یوں اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کی تکمیل رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں کر دی۔ اب قرآن اسلامی تعلیمات کا سرچشمہ ہے اور رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اُس کا عملی نمونہ۔ چنانچہ قرآن پاک میں جگہ جگہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور

آپؐ کی زندگی کو بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے:

{لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ ...} (الاحزاب:۲۱)

''بے شک تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے''۔

پھر فرمایا:

{یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَ لَا تُبۡطِلُوۡۤا اَعۡمَالَکُمۡ ﴿۳۳﴾} (محمد)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو ! اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور (اس کے خلاف کر کے) اپنے اعمال ضائع نہ کرو۔''

اب مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے شب و روز کے مشاغل میں سیرتِ طیبہ سے راہنمائی حاصل کرے' کیونکہ سیرتِ طیبہ ہی وہ طرزِ زندگی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ آپؐ کے طرزِ عمل کے خلاف کام کرنے سے سختی کے ساتھ منع کر دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَ مَنۡ یُّشَاقِقِ الرَّسُوۡلَ مِنۡۢ بَعۡدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الۡهُدٰی وَ یَتَّبِعۡ غَیۡرَ سَبِیۡلِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَ نُصۡلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتۡ مَصِیۡرًا ﴿۱۱۵﴾ ٪} (النساء)

''اور جو کوئی خلاف کرے رسول کے' بعد اس کے کہ اس پر ہدایت واضح ہو چکی' اور پیروی کرے مسلمانوں کی راہ کے علاوہ کسی دوسری راہ کی تو ہم پھیر دیں گے اس کو جدھر کو وہ پھرا اور ہم اس کو جہنم میں داخل کریں گے' اور وہ بری جگہ ہے پھر جانے کی''۔ اسی پر بس نہیں بلکہ اللہ اور رسول کی خلاف ورزی پر قیامت کے دن کی رسوائی اور ندامت کا نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے کر دیا کہ اُس وقت اپنے خلافِ سنت عمل پر پچھتاوا کسی کام نہ آئے گا۔ آج موقع ہے کہ وہی کام کیے جائیں جو رسول اللہ ﷺ نے زندگی بھر کیے اور جن کے کرنے کا حکم دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{یَوۡمَ تُقَلَّبُ وُجُوۡهُهُمۡ فِی النَّارِ یَقُوۡلُوۡنَ یٰلَیۡتَنَاۤ اَطَعۡنَا اللّٰهَ وَ اَطَعۡنَا الرَّسُوۡلَا ﴿۶۶﴾} (الاحزاب)

''جس دن پھیرے جائیں گے اُن کے چہرے آگ کے اندر' کہیں گے اے کاش ! ہم نے فرمانبرداری کی ہوتی اللہ کی اور اطاعت کی ہوتی رسول کی''

پس دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ ہر مسلمان رسول اللہ ﷺ کی سادہ اور صاف زندگی کو نمونہ بناتے ہوئے وہی کام کرے جو آپؐ نے کیے ہیں یا اُن کا حکم دیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ آپؐ نے خلفائے راشدین کے عمل کو بھی سند کا درجہ دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر کوئی چیز کتاب و سنت میں واضح نہ ہو تو صحابہ کرامؓ کے مجمع علیہ عمل کی پیروی کرو۔ آپؐ نے فرمایا:

((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ)) (ابوداؤد، ترمذی)

''پس تمہارے اوپر لازم ہے کہ میرا طریقہ اختیار کرو اور میرے ہدایت یافتہ اور راست رو خلفاء کا طریقہ اختیار کرو''۔

یوں آپؐ نے اُمت کے لیے مزید آسانی پیدا کر دی کہ اگر کسی معاملے میں سنت سے راہنمائی نہ مل رہی ہو تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل دیکھ لیا جائے، کیونکہ صحابہ وہ لوگ تھے جنہوں نے خود رسول اللہ ﷺ سے دین سیکھا۔ وہ قرآن کو خوب سمجھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کا اُسوۂ حسنہ ان کے سامنے تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی ہمہ وقت صحبت نے انہیں مزاج رسول کا شناسا بنا دیا تھا، لہٰذا ان کا طریقہ بھی سنت کی طرح مستند اور محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ آپؐ نے کسی کے عمل کو سند کا درجہ عطا نہیں کیا۔ تو اب ضروری ہوا کہ کتاب و سنت اور تعامل صحابہ تک محدود رہا جائے، کیونکہ اس کے علاوہ کسی عمل کو سند حاصل نہیں ہے کہ اسے اختیار کیا جائے۔

بدعت اُس کام کو کہتے ہیں جو بظاہر اچھا اور خوشنما ہو مگر نہ تو قرآن و سنت میں موجود ہو اور نہ ہی صحابہ کرامؓ کے عمل و کردار کا حصہ رہا ہو۔ ایسا کام خوشنما نظر آنے کے باوجود شریعت اسلامیہ میں ناپسندیدہ بلکہ گمراہی ہے۔ ایک صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((... مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ، فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الْمَهْدِيِّيْنَ الرَّاشِدِيْنَ، تَمَسَّكُوْا بِهَا وَ عَضُّوْا عَلَيْهَا

بِالنَّوَاجِذِ ، وَاِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ، فَاِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) (ابوداؤد، ترمذی)

''جو کوئی تم میں سے میرے بعد زندہ رہے گا وہ عنقریب بہت سے اختلافات دیکھے گا۔ پس تم پر میرے اور میرے ہدایت یافتہ اور راست رو خلفاء کے طریقے کی پیروی لازم ہے، اس کے ساتھ چمٹ جاؤ اور اسے اپنے دانتوں سے مضبوطی سے پکڑے رہنا، اور نئے نئے کاموں سے بچتے رہنا، کیونکہ ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے''۔

بدعت اس لیے مردود و مسترد ہے کہ یہ دین میں مداخلت ہے۔ دین تو مکمل ہو چکا' زندگی کے شب و روز گزارنے کا مستند اور محفوظ طریقہ ہمارے پاس موجود ہے' اب اس میں کسی طرح کے اضافے کی گنجائش نہیں۔ جس طرح دین میں کسی طرح کی کمی کرنا جائز نہیں اسی طرح اضافہ بھی جائز نہیں' کیونکہ متناسب اور مکمل چیز وہی ہوتی ہے جس میں کمی بھی اُس کے کمال میں نقص پیدا کر دے اور اضافہ بھی بگاڑ پیدا کرے۔ عام طور پر کمی کا نقص پیدا کرنا تو سمجھ میں آجاتا ہے مگر اضافہ ناگوار معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہم انسان کی بنائی ہوئی کسی بھی مکمل اور خوبصورت چیز میں اضافے کی گنجائش موجود پاتے ہیں' اسی طرح دین کو بھی مزید مزین کرنے کی کوشش کو ناپسندیدہ نہیں سمجھتے' حالانکہ ہم یہ بات بھول جاتے ہیں کہ دین تو اللہ کا بنایا ہوا اور مکمل کیا ہوا ہے' اس میں اب ذرّہ برابر اضافہ بھی اُسی طرح اس کے حسن کو متأثر کرے گا جس طرح اس میں سے کسی شے کو کم کر دینا۔ دین اسلام کی تکمیل کو انسان کی مکمل کردہ شے کی طرح سمجھنا سخت نادانی ہے۔ ایک شخص اپنا مکان تعمیر کرتا ہے' اس پر کثیر رقم خرچ کر کے ضرورت کی ہر شے مہیا کرتا ہے' عمارت کے ظاہری حسن کو قیمتی پتھروں اور رنگ برنگے شیشوں کے ساتھ مزین کرتا ہے' بجلی کے قمقموں کے ساتھ روشنی کا وافر بندوبست کرتا ہے' گویا اس کو ہر لحاظ سے مکمل کر لیتا ہے۔ یہ کام ایک انسان نے انتہائی جدوجہد کر کے اور ضروری وسائل استعمال کر کے مکمل کیا ہے' مگر عین ممکن ہے کہ اس کا کوئی دوست اس کے ہاں آئے اور صاحب خانہ کو کوئی خامی بتائے اور مزید بہتر کرنے کی تجویز دے جسے صاحب خانہ بھی

تسلیم کر لے۔ مگر دین میں جو خدا کا بنایا ہوا ہے اور مکمل کیا ہوا ہے اس میں اس طرح کی قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ کوئی شخص اس میں اضافہ تجویز کرے اور وہ قبول بھی کر لیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم بنایا۔ خوبصورت شکل و صورت اور متناسب اعضاء و جوارح عطا کیے۔ اگر اس کے کسی عضو میں خامی واقع ہو جائے تو اس کے جسم میں نقص پیدا ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر انسان کے چہرے پر دو آنکھیں سجائی گئی ہیں' اگر خدانخواستہ ایک آنکھ ضائع ہو جائے یا بالکل بند ہو جائے تو انسان کا وہی خوبصورت چہرہ بھیانک صورت اختیار کر لے گا۔ اسی طرح انسان کی متناسب اور موزوں ترکیب میں اضافہ بھی نقص اور برائی پیدا کر دے گا۔ غور کیجیے اگر کسی آدمی کے چہرے پر دو کی بجائے تین آنکھیں ہوں تو کیا اس ایک آنکھ کا اضافہ اس کو حسین تر کر دے گا؟ ہرگز نہیں' بلکہ وہ تو اسے بدصورت بنا دے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جو چیز کمال کی انتہا پر ہو اُس میں کسی اضافے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ صاف ظاہر ہے کہ جس چیز میں ابھی مزید بہتری کی گنجائش ہو اسے اکمل اور مکمل تو نہیں کہا جا سکتا۔ پہلے ذکر ہو چکا کہ انسان کی بنائی ہوئی کوئی شے اکمل اور مکمل ایک حد تک تو ہو سکتی ہے' مگر ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس میں مزید خوبی پیدا کرنے کی گنجائش نہ ہو' کیونکہ انسان بہرحال انتہا درجے کی

ذہانت اور صلاحیت کے باوجود کمزوریاں رکھتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ نہیں' وہ ہر طرح کے عیب اور کمزوری سے پاک ہے۔ اس لیے اس کا ہر کام کمالِ حکمت کا مظہر ہے۔ اس نے جس چیز کو تکمیل کے آخری مرحلے پر پہنچا دیا اب اس میں کمی کرنا اور زیادتی کرنا دونوں ایک جیسے جرم ہیں۔

دین اسلام کو اللہ تعالیٰ نے مکمل کر دیا۔ اب جو چیزیں اس میں داخل کر دی گئی ہیں بس وہی اس کے اجزاء ہیں۔ اگر اس کے اجزاء میں اضافہ کیا جائے گا تو وہ دین کے چہرے کو مزید خوشنما نہیں بنائے گا بلکہ بدنما کر دے گا۔ اسی لیے جو شخص رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو انسانیت کے لیے اُسوۂ حسنہ سمجھتا ہے اس کے دل میں تو کبھی یہ خیال نہیں گزر سکتا کہ رسول اللہ ﷺ کی مسنون چیزوں کے علاوہ بھی کوئی چیز دین کا جزو بن کر محل ثواب ہو سکتی ہے۔ آپؐ 'کی زندگی میں بچوں کی پیدائش اور خوشی کے دیگر مواقع بھی آئے'

چھوٹوں اور بڑوں کی وفات کا غم بھی آپؐ 'کو پیش آیا۔ ایسے مواقع پر رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل ہی پسندیدہ' جامع اور مکمل ہے' اس پر کسی طرح کا اضافہ نہ صرف یہ کہ قابل تحسین نہیں بلکہ مذمت کے لائق ہے۔

دین مکمل ہو چکا ۔ اب ہمارا فرض ہے کہ اس کے اوامر پر عمل کریں اور نواہی سے رکیں' اپنی طرف سے دین کے کسی کام میں ہرگز نہ کوئی کمی کریں اور نہ اضافہ' یہ دونوں ہی مذموم ہیں۔ کمی کا برا ہونا تو ظاہر ہے مگر زیادتی بھی اتنی ہی بری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَیْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ)) (صحیحین)

''جس شخص نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات پیدا کی جو دین میں نہیں تو وہ نامقبول ہے''۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ علیہ بدعت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

''ایسا کام کرنا جس کی اصل کتاب و سنت اور قرونِ مشہود لہا بالخیر میں نہ ہو اور اس کو دین اور ثواب کا کام سمجھ کر لیا جائے۔''

پس دین کے اندر کچھ تہواروں اور رسوم کا اپنی طرف سے اضافہ بدعت ہی ہے۔ اس کی ایک واضح پہچان یہ ہے کہ ان تہواروں کے منانے یا رسوم کی ادائیگی کا پروگرام شریعت سے نہیں ملے گا' بلکہ خود انسانوں کو اپنی خواہش کے مطابق ترتیب دینا ہو گا۔ غور کیجیے عیدالفطر اور عید الاضحی اسلامی تہوار ہیں۔ ان تہواروں کو منانے کا طریقہ اور پروگرام آپ کو قرآن و سنت اور عمل صحابہؓ سے مل جائے گا۔ اس کے علاوہ اگر کسی دن کو عید کا نام دیا جائے تو اس دن کا پروگرام کہاں سے لیا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ انسان اپنی پسند کے مطابق وہ پروگرام وضع کرے گا ۔ تو کسی انسان کا وضع کردہ پروگرام دین کا حصہ کیسے بن سکتا ہے ! پھر اسلام کی تعلیمات میں اور بہت کچھ ڈالا جا سکتا تھا' مگر

دانستہ طور پر خالق نے اوامر کو مختصر اور سادہ رکھا تاکہ اس پر عمل کرنا عوام الناس کے لیے آسان ہو۔ یہ تو بنی اسرائیل کا طریقہ تھا کہ انہوں نے بہت سے رسوم و رواج دین کے نام پر شروع کر دیے

تھے اور اس طرح دین کو مشکل بنا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو بھیج کر اُن اصر واغلال (دیکھئے الاعراف:۱۵۷) کے بوجھ سے انسان کو آزاد کیا اور دین میں آسانی پیدا کی' اور یہی اللہ کی مرضی بھی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

{یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَ لَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ} (البقرۃ:۱۸۵)

''اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتا''۔

پس دین کے اندر اضافے کر کے دین کی سادگی کو قائم نہ رہنے دینا اور مشکلات پیدا کرنا ہرگز محمود عمل نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ انسانوں کو قرآن کے الفاظ میں حکم دیتا ہے یا رسول اللہ ﷺ کی زبان سے احکام صادر فرماتا ہے۔ ایسے احکام کی تعمیل لوگوں پر لازم ہوتی ہے۔ یا پھر صحابہ کا عمل لوگوں کے لیے اختیار کرنا جائز ہے۔ اس کے علاوہ آج کون ہے جو اپنی طرف سے اُمت محمدؐ کو کسی کام کے بجا لانے کا حکم خود اپنی خواہش کے مطابق دے سکے اور اُمت اُس کے اختیار کرنے کی بھی اسی طرح پابند ہو جیسے کتاب و سنت کے احکام کی؟ یہ طرزِ عمل تو خود کو رسول ؐ کے مقام پر لا کھڑا کرنے کے مترادف ہے جو نری ہلاکت ہے۔ پس بدعات سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ ہمارے لیے وہی اعمال بہت کافی ہیں جو شریعت میں ہمارے لیے مقرر کر دیے گئے ہیں۔ اگر ہم ان کو صحیح انداز میں اپنا سکیں تو فہو المطلوب۔

بدعت انتہائی نامعقول عمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((کُلُّ بِدْعَۃٍ ضَلَالَۃٌ وَکُلُّ ضَلَالَۃٍ فِی النَّارِ)) (سنن النسائی)

''ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ میں ڈالے جانے کے لائق ہے''۔

یہی تو انسان کا امتحان ہے کہ وہ اپنی پسند وناپسند کو احکامِ شریعت کے تابع رکھے۔ شریعت کی روشنی کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے مطابق جو بھی عمل کیا جائے خواہ وہ کتنا ہی بھلا معلوم ہو اور نیت کتنی ہی اچھی ہو' نفسانی خواہش کی پیروی کی وجہ سے مردود و مسترد ہے۔ یہاں اس سوال میں کوئی معقولیت نہیں کہ ریل اور ہوائی جہاز پر سواری کیوں کی جاتی ہے جبکہ ان پر سواری نہ تو رسول اللہ ﷺ نے کی نہ صحابہ کرامؓ نے' کیونکہ ریل اور

ہوائی جہاز دنیاوی سامان ہے دین نہیں۔ مادی ایجادات سے شریعت کے اصولوں کے مطابق فقہاء کرام کی راہنمائی میں استفادہ کرنا بالکل جائز ہے، مگر بزعم خویش اچھی سے اچھی رسم ایجاد کرنا اور دوسروں کو اس عمل کی تلقین کرنا اور اس عمل کو کار ثواب سمجھنا بدعت ہے۔ آج مسلمان مساجد میں نئی نئی رسموں کی ادائیگی کے لیے مجالس منعقد کرتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ ان میںشامل ہو کر ثوابِ دارین حاصل کریں۔ ایسی خود ساختہ مجالس کا انعقاد ہی جائز نہیں تو ان پر ثواب کیسا؟ مگر ع دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے ! انسان کو فریب نفس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، ورنہ شیطان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ سبز باغ دکھا کر انسان کو غلط کام پر آمادہ کر لیتا ہے۔ جب آدمی فی سبیل اللہ خرچ کرنے لگتا ہے جو سراسر فائدے کی بات ہے تو شیطان نمود و نمائش پر اکساتا ہے تاکہ یہ عمل اکارت چلا جائے، یا پھر سرے سے خرچ کرنے ہی سے یہ کہہ کر روک دیتا ہے کہ خرچ کرو گے تو مفلس ہو جاؤ گے، یا پھر ایسی جگہ خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے جہاں خرچ مشروع نہ ہو۔ چنانچہ صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ جو کام بھی کیا جائے اُس کی شرعی حیثیت معلوم کرنے کے لیے قرآن و سنت اور عمل صحابہؓ کی طرف رجوع کیا جائے، تاکہ فریب نفس اور اغوائے شیطان سے محفوظ رہا جا سکے۔

قرض کا لین دین اور اسلامی تعلیمات

قرض لینا اچھی بات نہیں، مگر دنیا میں رہتے ہوئے ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ قرض لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ اسی لئے اسلام میں اس ناگزیر ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے قرض کے لین دین کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ قرآن مجید میں جہاں دوسرے اہم احکام بیان کئے گئے ہیں وہاں قرض کے معاملات کے سلسلہ میں آداب و ہدایات سورۃ البقرۃ میں بتائے گئے ہیں جہاں قرض کے معاملات کو گواہوں کی موجودگی میںلکھ لینے کی تاکید کی گئی ہے، تاکہ رقم کی مقدار اور ادائیگی کے طریق کار میں بھول چوک کا امکان نہ رہے۔ پھر قرض کے لین دین میں مدت کا تعین

بھی کئی الجھنوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ اسی طرح قرض کے معاملے میں کوئی چیز رہن رکھنے کی بھی اجازت ہے ‘البتہ احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شے مرہونہ سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔

قرض لینا بھاری ذمہ داری ہے ۔قرض دار کو قرضہ کی رقم واپس کرنا ہوتی ہے۔ جب تک وہ قرض کی رقم واپس نہیں کرتا وہ زیر بار رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس کے ذمہ قرض کی رقم ہو تو اُس وقت تک وہ سبکدوش نہیں ہوتا جب تک اس کے وارث وہ رقم ادا نہ کریں۔ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ جب کوئی جنازہ آتا تو پوچھ لیتے کہ اس کے ذمہ کوئی قرض تو نہیں ہے ! اگر قرض ہوتا تو اس کا جنازہ پڑھنے سے گریز کرتے۔ ایک دفعہ ایک جنازہ آیا ‘آپ ﷺ نے پوچھا :’’اس کے ذمہ قرض ہے ؟‘‘ بتایا گیا نہیں۔ تو آپؐ نے اس کا جنازہ پڑھا دیا۔ پھر ایک اور جنازہ لایا گیا۔ آپؐ نے پوچھا :’’اس کے ذمہ قرض ہے؟‘‘ بتایا گیا ہاں۔ پوچھا :’’یہ کچھ چھوڑ کر مرا ہے؟‘‘ بتایا گیا کہ ہاں تین دینار۔ پس آپؐ نے اس کا جنازہ پڑھا دیا۔ پھر تیسرا جنازہ لایا گیا ۔ آپؐ نے پوچھا :’’اس کے ذمہ قرض ہے ؟‘‘ بتایا گیا ہاں تین دینار۔ آپؐ نے

پوچھا:’’کیا اس نے کوئی ترکہ چھوڑا؟‘‘ لوگوں نے کہا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا:’’تم خود ہی اپنے ساتھی کا جنازہ پڑھ لو‘‘۔ یہ سن کر ابوقتادہ ؓ نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ اس کا جنازہ پڑھا دیجئے ! اس کے قرض کا ذمہ مَیں لیتا ہوں۔ چنانچہ آپؐ نے اس کی نماز جنازہ پڑھا دی۔ (۱)

ابتدا میں تو یہ صورت حال رہی ‘مگر بعد ازاں جب افلاس و ناداری کا دور ختم ہو گیا تو آپؐ نے اعلان فرما دیا کہ جو شخص اس حال میں مرجائے کہ اس کے ذمہ قرض ہو تو اس کے قرضے کی ادائیگی میں کر دیا کروں گا۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اس بات کو پسند نہیں فرماتے تھے کہ مرنے والا اپنے سر پر قرضہ لے کر مرے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک طرف تو خوشحال لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ ضرورت مند بھائیوں کو قرض دیں اور اس کی وصولی میں سختی نہ کریں ‘بلکہ سہولت کا رویہ اپنائیں‘ دوسری طرف قرض لینے والوں کو ہدایت کی کہ وہ جلد از جلد قرضے کی ادائیگی کی کوشش کریں۔ اگر خدانخواستہ وہ قرض ادا کئے بغیر اس دنیا سے چلے گئے تو آخرت میں یہ معاملہ ان کے لئے سنگین نوعیت کا ہو گا اور اس کی معافی بھی نہ ہو سکے گی۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اَعْظَمَ الذُّنُوْبِ عِنْدَ اللّٰہِ اَنْ یَّلْقَاہُ بِھَا عَبْدٌ بَعْدَ الْکَبَائِرِ الَّتِیْ نَھَی اللّٰہُ عَنْھَا اَنْ یَمُوْتَ رَجُلٌ وَعَلَیْہِ دَیْنٌ لَا یَدَعُ لَہٗ قَضَائً)) (۲)

’’ان کبیرہ گناہوں کے بعد جن سے اللہ تعالیٰ نے سختی سے منع فرمایا ہے ‘سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی

اس حال میں مرے کہ اس پر قرض ہو اور اس کی ادائیگی کا سامان نہ چھوڑ گیا ہو۔''
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

۱) صحیح البخاری، کتاب الحوالات، باب ان احال دین المیت علی رجل جاز۔

۲) سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب فی التشدید فی الدَّین۔

((نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهِ حَتّٰى يُقْضٰى عَنْهُ))(۳)

''مؤمن بندے کی روح اس کے قرضہ کی وجہ سے بیچ میں معلق رہتی ہے جب تک وہ قرض ادا نہ کر دیا جائے جو اُس پر ہے۔''
اس لئے ایسے شخص کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کے وارث جلدی سے جلدی اس کا قرض ادا کر دیں تاکہ مرنے والا راحت اور رحمت کے اس مقام پر پہنچ سکے جو مؤمنین صالحین کے لئے موعود ہے۔
قرض کا معاملہ اتنا سنگین ہے کہ شہید ہونے والے مرد مؤمن کے تمام گناہ بخش دیئے جاتے ہیں سوائے قرض کے۔
حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يُغْفَرُ لِلشَّهِيْدِ كُلُّ ذَنْبٍ اِلاَّ الدَّيْنُ))(۴)

''شہید ہونے والے مردِ مؤمن کے سارے گناہ (راہِ خدا میں جان کی قربانی دینے کی وجہ سے) بخش دیئے جاتے ہیں بجز قرض کے۔''
یہ اس لئے کہ حقوق العباد کا معاملہ بڑا سخت ہے۔جس کے حقوق تلف کئے گئے ہوں وہ خود ہی بخشے گا تو بخشے جائیں گے۔ اسی طرح یا تو قرضہ ادا کیا جائے یا پھر دائن قرضے کی رقم معاف کر دے، ورنہ وہ قرضہ مؤمن کے لئے انتہائی مصیبت کا باعث بنے گا۔
حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! مجھے بتلایئے کہ میں اللہ کے راستے میں صبر اور ثابت قدمی کے ساتھ اور اللہ کی رضا اور ثوابِ آخرت کی خاطر جہاد کروں اور مجھے اس حالت میں شہید کر دیا جائے کہ میں پیچھے نہ ہٹ رہا ہوں (بلکہ پیش قدمی کر رہا ہوں) تو کیا (اس شہادت اور قربانی کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ میرے سارے گناہ معاف کر دے گا؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا: ''ہاں''۔پھر جب وہ آدمی لوٹنے لگا تو آپؐ نے اس کو پھر پکارا

_____۳) سنن الترمذی، کتاب الجنائز عن رسول اللہﷺ باب ما جاء عن النبیﷺ انه قال: ((نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهِ))۴) صحیح مسلم، کتاب الامارة، باب من قتل فی سبیل الله کفرت خطایاه الا الدَّین۔

اور فرمایا:

((نَعَمْ اِلاَّ الدَّيْنَ ، كَذٰلِكَ قَالَ جِبْرِيْلُ))(۵)''ہاں سوائے قرضہ کے۔ یہ بات اللہ کے فرشتے جبریل امین نے اسی طرح بتلائی ہے''۔

جب قرض کا معاملہ اتنا سنگین ہے تو انتہائی مجبوری کے سوا قرض ہرگز نہیں لینا چاہئے۔ مکان کی تعمیر یا کاروبار کرنے کے لئے کچھ قرض لینا پڑے تو مناسب حد تک قرض لیا جا سکتا ہے اور وہ بھی اتنی مقدار میں جسے واپس کرنا ممکن نظر آ رہا ہو۔ مگر شادی بیاہ اور مرگ کی فضول رسموں کی ادائیگی اور بدعات کے لئے رقم قرض لینا ہرگز عقلمندی نہیں۔ ایک تو فضول رسمیں بذاتِ خود گناہ کا کام ہیں اور پھر اس گناہ کے کام پر ادھار کی رقم خرچ کرنا تو انتہائی حماقت ہے۔ یہ تو دنیا کی خاطر عاقبت برباد کرنے کے مترادف ہے۔

اوپر ذکر ہوا کہ انتہائی ناگزیر صورت میں قرض لینے کی اجازت ہے۔ یہ قرض اتنی مقدار میں ہو کہ لینے والے کے لئے مستقبل میں اس کا ادا کرنا ممکن ہو اور اُس کی نیت بھی ادا کرنے کی ہو۔ ان حالات میں اور اس نیت کے ساتھ قرضہ لیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی واپسی کے لئے سازگار حالات پیدا فرما دیتا ہے۔ جو شخص اس نیت سے قرضہ لیتا ہے کہ اس کا ارادہ واپس کرنے کا نہیں ہوتا تو اسے نہ تو واپسی کی توفیق ہوتی ہے اور نہ ہی وہ قرضے سے فارغ ہوتا ہے، بلکہ وہ قرضہ دنیا میں بھی اس کے لئے وبال بن جاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ اَخَذَ اَمْوَالَ النَّاسِ يُرِيْدُ اَدَاءَ هَا اَدَّى اللّٰهُ عَنْهُ وَمَنْ اَخَذَ يُرِيْدُ اِتْلَافَهَا اَتْلَفَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ))(٦)

۴) صحیح البخاری، کتاب الاستقراض واداء الدیون والحجر والتفلیس، باب من اخذ اموال الناس یرید اداءها او اتلافها۔

۵) صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب من قتل فی سبیل اللہ کفرت خطایاہ الا الدَّین۔

''جو شخص لوگوں سے ادھار مال لے اور اس کی نیت اور ارادہ ادا کرنے کا ہو تو اللہ تعالیٰ اس سے ادا کرا دے گا، اور جو کوئی کسی سے ادھار لے اور اس کا ارادہ ہی مار لینے کا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو تلف اور تباہ کردے گا۔''

مقروض کو چاہئے کہ وہ قرض دینے والے کا شکر گزار ہو اور اس کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کرے۔ نہ صرف ادائیگی خوش اسلوبی سے کرے بلکہ کچھ زائد رقم بھی دے دے تو یہ مستحسن ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہی طرزِ عمل تھا۔ حدیث ملاحظہ فرمائیں!

عَنْ جَابِرٍ قَالَ :((كَانَ لِيْ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ دَيْنٌ فَقَضٰى لِيْ وَزَادَنِيْ))(۷)

''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میرا رسول اللہ ﷺ پر کچھ قرض تھا' تو آپؐ نے جب وہ ادا فرمایا تو کچھ رقم زیادہ واپس کی۔''

اس طرح کی زائد رقم پر ربا کا اطلاق نہیں ہوتا 'کیونکہ یہ رقم نہ تو کسی شرط کے تحت طے شدہ ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا مطالبہ کیا جاتا ہے 'بلکہ یہ تو محض حسن سلوک کے طور پر رضاکارانہ ہوتی ہے۔ اس لئے یہ سود نہیں بلکہ تبرع اور احسان ہے۔ اس طرح کی سنتوں کو رواج دینا آج کی ضرورت ہے۔

ایک ضرورت مند شخص ادھار مانگتا ہے۔ ایسے شخص کی مدد کرنا اور اسے قرض کی رقم فراہم کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ مقروض کو ایسے شخص کے احسان کو یاد رکھنا چاہئے اور رقم کی جلد از جلد واپسی کی کوشش کرنی چاہئے۔ اگر مقروض وقت پر رقم ادا نہ کر سکے تو اس کی بدحالی اور مجبوری کے پیش نظر قرض کا تقاضا کرنے والا اگر اس کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے اسے مہلت دیتا ہے اور نرمی اختیار کرتا ہے تو بہت بڑا ثواب حاصل کرتا ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا سَمْحًا اِذَا بَاعَ وَاِذَا اشْتَرٰى وَاِذَا اقْتَضٰى))(۸)

---

۷) سنن ابی داوٗد' کتاب البیوع' باب فی حسن القضاء۔

۸) صحیح البخاری' کتاب البیوع' باب السهولة والسماحة فی الشراء والبیوع ومن طلب حقا۔

''اللہ کی رحمت اس بندے پر جو بیچنے میں' خریدنے میں اور اپنے حق کا تقاضا کرنے اور وصول کرنے میں نرم اور فراخ دل ہو''۔

بخاری اور مسلم میں ایک حدیث ہے کہ ایک شخص سے اُس کی موت کے بعد پوچھا جائے گا کہ اپنی دُنیوی زندگی پر نظر ڈال اور بتا کہ تیرا کوئی نیک عمل ہے جو تیرے لئے وسیلہ نجات بن سکے ؟وہ عرض کرے گا کہ میرے علم میں میرا کوئی ایسا عمل نہیں سوائے اس کے کہ میں لوگوں کے ساتھ کاروبار اور خرید و فروخت کا معاملہ کیا کرتا تھا تو میرا رویہ ان کے ساتھ درگزر اور احسان کا ہوتا تھا۔ میں مال دار کو بھی مہلت دیتا تھا اور غریبوں اور مفلسوں کو معاف بھی کر دیتا تھا ۔اس پر اللہ تعالیٰ اس شخص کے لئے جنت میں داخلہ کا حکم فرما دے گا۔(۹)

ضرورت مند کو قرض دے کر تقاضا کرنے میں نرمی اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا ہی محبوب اور مقبول عمل ہے۔ حضرت ابوالیسر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا' آپؐ ارشاد فرماتے تھے:

((مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْ وَضَعَ عَنْهُ اَظَلَّهُ اللّٰهُ فِیْ ظِلِّهٖ))(۱۰)

''جو بندہ کسی غریب تنگدست کو مہلت دے یا معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے سایۂ رحمت میں لے لے گا۔''

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ لَهٗ عَلٰى رَجُلٍ حَقٌّ فَمَنْ اَخَّرَهٗ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ يَوْمٍ صَدَقَةٌ))(۱۱)

''جس آدمی کا کسی دوسرے بھائی پر کوئی حق (قرضہ وغیرہ) واجب الادا ہو اور وہ اس مقروض کو ادا کرنے کے لئے دیر تک مہلت دے دے تو اُس کو ہر دن کے عوض صدقہ کا ثواب ملے گا۔''

اسی طرح قرض دے کر کسی ضرورت مند کی مدد کرنا بہت بڑا کارِ ثواب اور اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول عمل ہے۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

---

۹) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔

۱۰) صحیح مسلم، کتاب الزھد والرقائق، حدیث جابر الطویل وقصۃ ابی الیسر۔

۱۱) مسند احمد، کتاب اوّل مسند البصریین، باب حدیث عمران بن حصین۔

((دَخَلَ رَجُلٌ الْجَنَّۃَ فَرَاٰی عَلٰی بَابِھَا مَکْتُوْبًا اَلصَّدَقَۃُ بِعَشْرِ اَمْثَالِھَا وَالْقَرْضُ بِثَمَانِیَۃَ عَشَرَ))(۱۲)

''ایک آدمی جنت میں داخل ہوا تو اس نے جنت کے دروازے پر لکھا دیکھا کہ صدقہ کا اجر و ثواب دس گنا ہے اور قرض دینے کا اٹھارہ گنا۔''

یہ کسی مردِ صالح کا خواب ہو سکتا ہے یا پھر خود آپ ﷺ کا مشاہدہ۔ اس دوسرے احتمال کی تائید ابن ماجہ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں نے جبریل سے پوچھا قرض میں کیا خاص بات ہے کہ وہ صدقہ سے افضل ہے ؟تو انہوں نے بتایا کہ سائل اس حالت میں بھی سوال کرتا اور صدقہ لے لیتا ہے جبکہ اس کے پاس کچھ ہوتا ہے اور قرض مانگنے والا قرض جب ہی مانگتا ہے جب وہ محتاج اور ضرورت مند ہوتا ہے''۔(۱۳)

بعض اوقات آدمی مفلسی کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے، مگر اس کی عزتِ نفس یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ کسی سے صدقہ و خیرات یا زکوٰۃ لے کر اپنی اور بچوں کی ضرورت پوری کر لے، بلکہ وہ چاہتا ہے کہ کسی صاحب خیر سے رقم بطورِ قرض مل جائے۔تو ایسے محتاج کو قرض دینا یقینا صدقہ اور خیرات سے بھی افضل ہے۔

حاصل کلام یہ کہ عام حالات میں قرض لینے سے ضرور بچنا چاہئے، کیونکہ قرض بہت بھاری ذمہ داری ہے۔اگر اس کو واپس نہ کیا جائے تو اس کی معافی کی کوئی صورت نہیں سوائے اس کے کہ خود صاحب مال معاف کر دے، مگر قیامت میں کون معاف کرے گا جب کہ نفسانفسی کا عالم ہو گا۔ خاص طورپر شادی بیاہ اور مرگ کی فضول رسومات کو قرض لے کر پورا کرنا دُنیوی اور اُخروی دونوں اعتبارات سے خسارے کا موجب ہے۔ پھر خود ساختہ بدعات کے لئے قرض لے کر خرچ کرنا تو اور بھی برا ہے۔ قرض انتہائی مجبوری میں لینا چاہئے اور واپس کرنے کی نیت سے لینا

۱۲) رواہ الطبرانی فی الکبیر۔

۱۳) سنن ابن ماجہ، کتاب الاحکام، باب القرض۔

چاہیئے۔ ایسے قرضے کی واپسی کے لئے اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد شامل حال ہو جاتی ہے۔ حقیقی ضرورت مند کو قرض دینا بہت بڑی نیکی ہے' بلکہ جیسا کہ اوپر گزرا 'ایسا قرض صدقے سے بھی افضل ہے۔

قرض کے لین دین کی دستاویز تیار کرنا ضروری ہے۔ عام طور پر اس حکم کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور مروّت کے پیش نظر قرض کی رقم اور شرائط ادائیگی پر مشتمل تحریر کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ مگر بعد ازاں جب جھگڑے اٹھتے ہیں تو اس حکم کی اہمیت اوراسے نظر انداز کرنے کے نقصانات سامنے آتے ہیں۔ اس لئے قرض کا معاملہ چاہے اپنوں کے ساتھ ہو یا غیروں کے ساتھ' اسے گواہوں کی موجودگی میں تحریر کر لینا ضروری ہے۔ بعض اوقات مقروض بروقت قرض ادا نہیں کر سکتا اور مزید مہلت کا خواستگار ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اسے مہلت دینا بہت بڑی نیکی ہے' کیونکہ ایسا کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جو مال و دولت اس کے پاس ہے اصل میں وہ اللہ ہی کا مال ہے اور اس مال و دولت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا یہ اچھا طریقہ ہے کہ اس کے ضرورت مند اور محتاج بندوں کو مال ادھار دیا جائے اور انہیں واپس ادائیگی میں سہولت دی جائے۔

غُرورُ الغَرور

(بڑے دھوکے باز کا دھوکہ)

ابلیس جب اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کرکے بارگاہِ خداوندی سے رجیم (مردود) ٹھہرا تو اُس نے مہلت مانگی تاکہ اولادِ آدم کو قیامت تک گمراہ کرتا رہے۔ چنانچہ اسے یوم القیامۃ تک مہلت دے دی گئی ‘لیکن خدائے رحمن و رحیم نے اپنے بندوں کو بھی آگاہ کر دیا کہ شیطان ہر وقت اُن کو گمراہ کرنے کی تاک میں لگا رہے گا اور جونہی وہ موقع پائے گا انہیں گمراہ کرکے خدا کے حضور ذلیل و خوار کر دے گا۔ بالفاظِ قرآنی:

{قَالَ فَبِمَآ اَغۡوَیۡتَنِیۡ لَاَقۡعُدَنَّ لَہُمۡ صِرَاطَکَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ لَاٰتِیَنَّہُمۡ مِّنۡۢ بَیۡنِ اَیۡدِیۡہِمۡ وَ مِنۡ خَلۡفِہِمۡ وَ عَنۡ اَیۡمَانِہِمۡ وَ عَنۡ شَمَآئِلِہِمۡ ؕ وَ لَا تَجِدُ اَکۡثَرَہُمۡ شٰکِرِیۡنَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اخۡرُجۡ مِنۡہَا مَذۡءُوۡمًا مَّدۡحُوۡرًا ؕ لَمَنۡ تَبِعَکَ مِنۡہُمۡ لَاَمۡلَئَنَّ جَہَنَّمَ مِنۡکُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۱۸﴾ } (الاعراف)

’’بولا (شیطان) چونکہ آپ نے مجھے گمراہ کر دیا ہے تو میں بھی لوگوں کے لیے آپ کی سیدھی راہ پر بیٹھ کر رہوں گا ‘پھر ان کو اُن کے سامنے سے بھی آلوں گا اور اُن کے پیچھے سے بھی اور ان کے داہنے سے بھی اور اُن کے بائیں سے بھی‘ اور آپ اُن میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :یہاں سے تو نکل ذلیل و خوار ہو کر۔ ان میں سے جو کوئی تیری پیروی کرے گا سو میں تم سب سے جہنم کو بھر کر رہوں گا۔‘‘

اس یاد دہانی کی خاطر ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو نبی اور رسول بنا کر بھیجتا رہا جو انسانوں کو شیطان کے دھوکے سے بچنے اور خدا کی خوشنودی کے حصول کی از حد تلقین کرتے رہے۔ انسان فطری طور پر عجلت پسند اور جلد باز واقع ہوا

ہے۔جہاں اس کو نقد مفاد نظر آتا ہے اُس کی طبیعت ادھر لپکتی ہے ‘لیکن خدا کے نیک بندے ہر وقت خدا کی رضا اور خوشنودی کی طرف نظر رکھتے ہیں۔ وہ ظاہری اور وقتی مفادات کے پیچھے نہیں پڑتے مگر ایسے لوگ ہمیشہ قلیل تعداد میں رہے ہیں۔ قَلِیۡلٌ مِنۡ عِبَادِیَ الشَّکُوۡرُ۔

شیطان گمراہی کے شعبے کا سربراہ ہے۔ اس لیے وہ اپنے کام میں حد درجہ ماہر ہے۔ وہ ہر وقت اپنے نامسعود مشن میں مشنری سپرٹ کے ساتھ مصروف ہے۔ اُس کا طریق واردات دھوکہ دے کر انسان کو برائی پر ورغلانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ برائی کو برائی کی صورت میں پیش کیا جائے تو اُس کے قبول میں پس وپیش ہو گا‘ اس لیے وہ ہر برائی کو اچھائی کے روپ میں پیش کرتا ہے اور نقصان دہ کام کو مفید دکھلاتا ہے۔ برے اعمال کو دلکش اور مزین کر کے پیش کرتا ہے۔

شیطان نے پہلا حملہ سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام پر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو

جنت کے مخصوص درخت کا پھل کھانے سے روک دیا۔ لیکن شیطان نے آدمؑ کو یہ کہہ کر اُس درخت کا پھل کھانے پر آمادہ کر لیا کہ اُس کا پھل کھا کر وہ ہمیش ہمیش کے لیے جنت میں رہ جائیں گے۔ جنت میں قیام کے خوشنما تصور کو پیش کر کے شیطان آدمؑ کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر شیطان آدم علیہ السلام پر کامیاب حملہ کر سکتا ہے تو عام انسان کی کیا حیثیت ہے ؟لیکن جس طرح ہر دور میں خدائے رحمن و رحیم نے شیطان کے حملوں سے بچ نکلنے کی تلقین کی ہے اُسی طرح قرآن پاک میں بھی تفصیل کے ساتھ شیطانی وساوس سے بچنے اور عمدہ کردار اور اخلاق اپنا کر اُسوۂ حسنہ کے مطابق عمل کرنے کی نصیحت کی گئی ہے ‘نیز شیطان کے پیروکاروں کو ابدی عذاب اور پیغمبروں کے فرمابرداروں کو ابدی راحت کی خوشخبری دی گئی ہے۔

قرآن پاک میں شیطانی حملے اور دھوکہ دہی کے طریق کار کی بھی وضاحت کی گئی ہے‘ حتیٰ کہ شیطان کو الغَرور یعنی بڑا دھوکے باز کہا گیا ہے ۔وہ بڑے سے بڑے آدمی کو

دھوکہ دینے سے نہیں چوکتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں انسان کو شیطان کے شر سے رحمان کی پناہ میں آنے کی دعا سکھائی ہے۔ شیطان انسان کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتا ہے ‘لیکن دھوکہ دینے کی غرض سے کہتا ہے کہ اس طرح مال کم ہو جائے گا۔ لالچ میں آکر انسان انفاق فی سبیل اللہ سے باز رہتا ہے اور اپنی دولت کے انبار اور بینک کی پاس بک دیکھ کر پھولا نہیں سماتا۔ اس طرح اُس کی نظر سے اللہ کی راہ میں خرچ کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کرنا اوجھل ہو جاتا ہے۔ شیطان کسی کو جھوٹ بولنے ‘ شراب پینے‘ رشوت کھانے اور جوا کھیلنے کی براہِ راست ترغیب نہیں دیتا ‘بلکہ ان اعمال میں سے ہر عمل کی ایسی توجیہہ پیش کرتا ہے کہ انسان اس عملِ بد کو کرنے پر بآسانی آمادہ ہو جاتا ہے۔ شیطان کا یہ طریق کار بنی اسرائیل کو گمراہ کرنے سے اچھی طرح واضح ہے جب وہ ہفتہ کے دن شکار کرنے سے اپنے خیال میں تو باز ہی رہے لیکن جو حیلہ سازی شیطان کی پیروی میں انہوں نے اختیار کی وہ اُن پر عذابِ عظیم کا باعث بنی۔

قرآن پاک کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بخشش کے لحاظ سے گناہوں کی دو قسمیں ہیں ‘ایک قابل بخشش دوسری ناقابل بخشش۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شرک ناقابل بخشش اور باقی سب گناہ قابل بخشش

ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِہٖ وَ یَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَ مَنۡ یُّشۡرِکۡ بِاللّٰہِ فَقَدۡ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِیۡدًا ﴿۱۱۶﴾}(النساء)

''بے شک اللہ معاف نہیں کرتا کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے' اور اس کے دوسرے گناہ جس قدر ہوں معاف کر دیتا ہے جس کے لیے چاہے' اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا وہ دور کی گمراہی میں جا پڑا۔''

چونکہ شیطان انسان کا بدترین دشمن ہے اس لیے اس کا پورا زور لوگوں میں شرک پھیلانے پر رہا ہے تاکہ لوگ حتمی طور پر مغفرتِ خداوندی کے اہل نہ رہیں۔

دنیا میں مسلمانوں کے علاوہ کچھ لوگ لامذہب' کافر' بت پرست یا اہل کتاب یہود و نصاریٰ ہیں جن میں یہود و نصاریٰ اگرچہ توحید کی تعلیم کے علمبردار تھے مگر شیطان اُن

کے عقائد میں شرک کو داخل کر کے انہیں مشرکین کے زمرے میں شامل کر چکا ہے۔ صرف مسلمان اب توحید کامل کے حامل ہیں جن کے سامنے قرآن پاک کی صورت میں خالق کائنات کی بھیجی ہوئی صحیح تعلیمات غیر متبدل موجود ہیں۔ مگر شیطان کو یہ کیونکر گوارا ہو سکتا ہے کہ دنیا میں توحید خالص کی ترویج ہو؟ چنانچہ اُس نے مسلمانوں میں بھی اس ناقابلِ بخشش گناہ کو مزین صورت میں پیش کیا۔ آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ کلمہ گو مسلمان بدترین شرک میں ملوث ہیں۔

جو مسلمان نماز میں {اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ }بار بار پڑھتے ہیں وہ نبیوں اور ولیوں کی روحوں سے بھی استعانت کرتے ہیں اور پھر گرتے گرتے یہاں تک گر جاتے ہیں کہ گھوڑوں اور گائیوں سے استعانت سے بھی نہیں شرماتے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہے: {لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ }لیکن آج مسلمان مخلوق میں خالق کی صفات بلاتأمل تسلیم کرتے ہیں۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو آسمان اور زمین کی باریک سے باریک چیز کی حقیقت اور وجود کو جاننے والا ہے۔ ہر شخص کو جس قدر چاہے علم عطا کرتا ہے۔ ہر فرد کا علم اُس کے علم کے سامنے ہیچ ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

{قُلۡ لَّا یَعۡلَمُ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ الۡغَیۡبَ اِلَّا اللّٰہُ ؕ وَ مَا یَشۡعُرُوۡنَ اَیَّانَ یُبۡعَثُوۡنَ ﴿۶۵﴾}(النمل)

''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا' اور وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔''

{وَ یَقُوۡلُوۡنَ لَوۡ لَاۤ اُنۡزِلَ عَلَیۡہِ اٰیَۃٌ مِّنۡ رَّبِّہٖ ۚ فَقُلۡ اِنَّمَا الۡغَیۡبُ لِلّٰہِ فَانۡتَظِرُوۡا ۚ اِنِّیۡ مَعَکُمۡ مِّنَ الۡمُنۡتَظِرِیۡنَ

﴿ ۲۰ ﴾} (یونس)

''اور وہ کہتے ہیں کیوں نہ اتاری گئی اس پر کوئی نشانی اُس کے پروردگار کی طرف سے؟ پس کہہ دیجیے علم غیب تو سراسر خدا کے پاس ہے بس تم انتظار کرو' میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔''

{قُلۡ لَّاۤ اَقُوۡلُ لَکُمۡ عِنۡدِیۡ خَزَآئِنُ اللّٰہِ وَ لَاۤ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ وَ لَاۤ اَقُوۡلُ لَکُمۡ اِنِّیۡ مَلَکٌ ۚ اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ؕ} (الانعام:۵۰)

''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ ہی میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں 'میں تو صرف اُسی وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔''

{قُلۡ لَّاۤ اَمۡلِکُ لِنَفۡسِیۡ نَفۡعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ ؕ وَ لَوۡ کُنۡتُ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ لَاسۡتَکۡثَرۡتُ مِنَ الۡخَیۡرِ ۬ۛۚ وَ مَا مَسَّنِیَ السُّوۡٓءُ ؕ اِنۡ اَنَا اِلَّا نَذِیۡرٌ وَّ بَشِیۡرٌ لِّقَوۡمٍ یُّؤۡمِنُوۡنَ ﴿ ۱۸۸ ﴾ ٪} (الاعراف)

''کہہ دیجیے میں مالک نہیں ہوں اپنے واسطے برے کا اور بھلے کا مگر جو چاہے اللہ۔ اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں اپنے لیے بہت سے فائدے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ میں تو ایمان لانے والوں کے لیے تنبیہہ کرنے اور خوشخبری دینے والا ہوں۔''

قرآن پاک کی ان تصریحات کے باوجود کہ تنہا اللہ تعالیٰ ہی عالم الغیب ہے اور اس کے رسول ﷺ عالم الغیب نہیں ہیں' آج مسلمان بڑے واضح الفاظ میں آنحضرت ﷺ کو عالم الغیب اور ماکان ومایکون کا علم رکھنے والا مانتے ہیں۔ کچھ دوسرے مسلمان صلحائے اُمت اور شہداء کو عالم الغیب سمجھتے ہیں حالانکہ قرآن کی مندرجہ بالا تصریحات کے علاوہ قرآن میں انبیاء اور نیک لوگوں کے واقعات بھی موجود ہیں جن سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا عالم الغیب نہیں ہے۔

قرآن پاک کی رو سے تمام اختیارات کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی ہر قسم کے نفع اور نقصان کا مالک ہے' حفاظت کرنے والا' زندگی اور موت پر اختیار رکھنے والا ہے' دعائیں سننا' نگہبانی کرنا' قسمت کا بنانا' بگاڑنا اُس کے ہاتھ میں ہے۔ حرام و حلال' جائز و ناجائز کی حدود متعین کرنا اور انسانی زندگی کے لیے شریعت تجویز کرنا اسی کے اختیار میں ہے۔ سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے:

{یَقُوۡلُوۡنَ ہَلۡ لَّنَا مِنَ الۡاَمۡرِ مِنۡ شَیۡءٍ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡاَمۡرَ کُلَّہٗ لِلّٰہِ ؕ} (آیت ۱۵۴)

''وہ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے۔ کہہ دیجیے اختیارات تو سارے کے سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔''

کیا پیغمبر یعنی خدا کے پیارے اور برگزیدہ بندے دوسروں کے نفع نقصان کے مختار ہیں یا وہ اپنے نفع نقصان کے مالک ہوتے ہیں؟ فیصلہ کلامِ الٰہی سے سنیے:

{قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ} (یونس:۴۹)

''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے میرے اختیار میں تو اپنا نفع اور ضرر بھی نہیں، مگر جو اللہ چاہے۔ (سب کچھ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے)۔''

{قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّ لَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۲﴾} (الجن)

''کہہ دیجیے میں تم لوگوں کے لیے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا۔ کہہ دیجیے مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ میں اس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ پا سکتا ہوں۔''

{وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ ۚ وَ اِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ؕ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۷﴾} (یونس)

''اور اگر اللہ تجھے کوئی نقصان دے تو اُس کو سوائے اس کے کوئی دور کرنے والا نہیں، اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرے تو اُس کے فضل کو کوئی پھیرنے والا نہیں۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنا فضل پہنچاتا ہے۔ اور وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔''

ان قرآنی تصریحات کے مطابق اللہ تعالیٰ ہی جملہ اختیارات کا مالک ہے۔ وہی مخلوقات کے نفع اور نقصان پر قادر ہے۔ اگر وہ کسی کو نفع پہنچانا چاہے تو کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ اور اگر وہ کسی کو نقصان پہنچانا چاہے تو کوئی دوسرا اسے نفع نہیں دے سکتا۔ لیکن آج مسلمان ہر کس وناکس کو مشکل کشا، حاجت روا اور داتا کے نام دیتے اور اللہ کی کتاب کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں اور بڑے دھوکہ باز سے دھوکا کھا رہے ہیں۔ اس ضمن میں مزید سنیے:

{... ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ﴿۱۳﴾ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَ لَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ؕ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ؕ} (فاطر:۱۳، ۱۴)

''...یہی ہے اللہ پروردگار تمہارا، اُسی کے واسطے ہے بادشاہی۔ اور اُس (اللہ) کو چھوڑ کر جن دوسروں کو تم پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے مالک بھی نہیں۔ اگر تم انہیں پکارو تو تمہاری دعائیں

سن نہیں سکتے ‘اور اگر سن لیں تو اُن کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ اور قیامت کے روز وہ تمہارے شرک کا انکار کریں گے۔‘‘

{قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴿ ٥٦ ﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿ ٥٧ ﴾} (بنی اسراءیل)

’’ان سے کہیے پکار دیکھو اُن معبودوں کو جن کو تم خدا کے سوا اپنا کارساز سمجھتے ہو‘ وہ کسی تکلیف کو تم سے ہٹا سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں ۔ جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ تو خود اپنے ربّ کے حضور رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ تلاش کر رہے ہیں کہ کون اس سے قریب تر ہو جائے‘ اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں۔ بے شک تیرے پروردگار کا عذاب ایسا ہی ہے کہ اُس سے خوف کھایا جائے۔‘‘

صاف ظاہر ہے کہ یہ آیات بتوں کے متعلق نہیں ہیں‘ بلکہ صلحائے اُمت اور بزرگانِ دین کے متعلق ہیں۔ ہمیشہ سے شیطان کا یہ طریق کار رہا ہے کہ وہ عوام کو انبیاء اور صلحاء کی قبروں کی طرف متوجہ کرتا ہے ‘کیونکہ لوگ بزرگوں پر اعتقاد اور حسنِ ظن رکھتے ہیں۔ اس یقین کا فائدہ اٹھا کر وہ لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے کہ یہ قبروں کے اندر بھی تمہاری ہر طرح کی بات سنتے ہیں اور مدد کو پہنچتے ہیں‘ وہ خدا رسیدہ ہیں اس لیے تمہاری مشکلات خدا تعالیٰ سے سفارش کر کے حل کرا دیں گے۔ چنانچہ لوگوں نے بزرگوں کی قبروں کو بچا کر

رکھنے کے لیے پختہ‘ مضبوط اور خوبصورت بنایا اور ان پر عمارتیں کھڑی کیں۔ اُن کے مزار مرجع خلائق بن گئے۔ اُمت مرحومہ پر بھی شیطانی دھوکہ اثر انداز ہوا اور وہ یہود و نصاریٰ کی طرح قبروں کا طواف کرنے‘ وہاں دعائیں مانگنے اور حاجات طلب کرنے میں مشغول ہو گئے اور شرک کا ارتکاب کر کے ابلیس کے تکمیل مشن کا باعث ہوئے۔ حالانکہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کے ظہور کے اس قدیم ترین راستے کو یہ کہہ کر قطعی مسدود کر دیا تھا کہ میں تمہیں قبروں کو پختہ کرنے اور اُن پر عمارت بنانے سے منع کرتا ہوں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہسے مروی ہے کہ:

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ يُجَصَّصَ الْقَبْرُ وَاَنْ يُّقْعَدَ عَلَيْهِ وَاَنْ يُبْنٰى عَلَيْهِ (رواہ مسلم)

’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ قبر کو پختہ کیا جائے‘ اُس پر بیٹھا جائے اور اُس پر عمارت بنائی جائے‘‘۔

اور فرمایا:

نَهَى النَّبِيُّ ﷺ اَنْ تُجَصَّصَ الْقُبُوْرُ وَاَنْ يُكْتَبَ عَلَيْهَا وَاَنْ تُوَطَّأَ (رواہ الترمذی)

’’منع فرمایا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو پختہ کرنے سے اور قبروں پر لکھنے سے اور قبروں کو روندنے سے۔‘‘

چنانچہ آنحضرت ﷺ نے خود زندگی بھر نہ کسی کی قبر پختہ کی نہ اس پر عمارت بنوائی اور کوئی تحریر لکھوائی۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی اسی سنت پر عمل رہا۔ خود عم رسولؐ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ۳ھ میں میدانِ اُحد میں شہید ہوئے۔ آپؐ نے انہیں سید الشہداء کہا' خود ہی ان کی تجہیز و تکفین کی۔ اُن کی قبر عہد رسالت میں اسی طرح خاک کی بنی ہوئی رہی' عہد صحابہ میں بھی بحالہٖ قائم رہی اور آج تک میدانِ اُحد میں بغیر عمارت اور قبے کے موجود ہے۔ رسول پاکؐ کے واضح ارشادات' آپؐ کے اُسوۂ حسنہ اور خلفائے راشدین کے طریقے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے آج مسلمان اپنے بزرگوں کی قبریں پختہ بنا رہے ہیں' ان پر عمارتیں اور قبے تعمیر کر رہے ہیں' ان کے اوپر تحریریں لکھ رہے ہیں۔ یہ

کیوں ہورہا ہے؟ یہ سب کچھ شیطانی دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔ شیطان اچھے روپ میں برے کام پیش کرتا ہے۔ حالانکہ بزرگوں کے احترام کا طریقہ خود شریعت اسلامیہ' صحابہ کرامؓ اور تابعین کے عمل سے واضح ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو بزرگوں کے گستاخ سمجھنا خود پرلے درجے کی حماقت ہے۔ جس طریق سے وہ اپنے بزرگوں کا احترام کرتے تھے وہی صحیح طریقہ تھا۔ قبر پرستی کا اُس دور میں نشان تک نہیں ملتا۔

مختصر یہ کہ جس طرح شیطان کی ہمیشہ سے یہ سرتوڑ کوشش ہے کہ لوگوں کو ناقابل معافی گناہ (شرک) میں مبتلا کر کے اُن پر جنت کا دروازہ بند کرا دے اسی شدت کے ساتھ ہمیں اس بات کا احساس ہر وقت پیش نظر رہنا چاہیے کہ شرک ہم سے ہرگز سرزد نہ ہو۔ ہم بار بار قرآن و سنت کی روشنی میں اپنے اعمال کا جائزہ لیتے رہیں اور اطمینان کر لیں کہ ہم کسی شیطانی دھوکے میں آکر وہ کام نہیں کر رہے جن سے ہادیٔ اعظم ﷺ نے ہمیں منع کیا ہے۔ کیونکہ یہ شیطانی دھوکہ انجامِ کار ابدی زندگی کی تباہی کا موجب بنے گا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

{ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَ مَاْوٰىهُ النَّارُ }(المائدۃ:۷۲)

''جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا پس اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اُس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔''

حقوقِ اولاد

عام طور پر حقوقِ والدین پر بڑا زور دیا جاتا ہے اور بچوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ اپنے والدین کے فرماں بردار رہیں اور ہر وقت ان کا ادب و احترام ملحوظ رکھیں، کبھی گستاخی کا کلمہ ان کی زبان سے نہ نکلنے پائے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بچوں کو سکھانے اور تعلیم دینے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ ناسمجھی میں ان سے خلافِ ادب حرکات سرزد ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں، لیکن اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ پند و نصائح کرنے والے لوگ بڑی عمر کے ہوتے ہیں۔ اکثر صاحبِ اولاد بھی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اولاد کو فرماں بردار دیکھنا چاہتے ہیں۔ وعظ و نصیحت کے ان کلمات میں ان کی اپنی غرض بھی شامل ہوتی ہے۔

تھوڑا سا غور کریں تو انسان آسانی سے یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ بچوں کو ان کے فرائض یاد دلانے واقعتا بہت ضروری ہیں، مگر اس سے بھی اہم تر یہ ہے کہ بڑے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کماحقہٗ دلچسپی لیں اور بچوں کی تربیت اس نہج پر کریں کہ عمر کے ساتھ ساتھ بچے خود بخود اپنے فرائض سے آگاہ ہوتے جائیں اور اپنے والدین کی مثال سامنے رکھتے ہوئے فرائض کی ادائیگی میں چستی اور مستعدی کا مظاہرہ کریں۔ ویسے بھی حقوق و فرائض کا عمل دو طرفہ ہے۔ ایک فریق کا رویہ دوسرے فریق کو متاثر کرتا ہے۔ اگر والدین اپنے فرائض کی ادائیگی میں چوکس (vigilant)ہوں تو بڑی حد تک ان کی اولاد فرض شناس اور ذمہ دار ہو گی۔ اگر ایک باپ گھر میں سگریٹ نوشی کرتا ہے تو یہ بُری عادت ہے اور صحت کے لیے بھی نقصان دہ ہے، لیکن اس کا بھیانک پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت میں بھی کوتاہی کا ارتکاب کر رہا ہے، کیونکہ خود تمباکو نوشی کرنے والا اپنے

بیٹے کو اس سے باز رہنے کی نصیحت کیسے کر سکتا ہے؟ اور اگر کرے بھی تو اُس کا اثر کیا ہو گا؟ اب اگر بچہ بڑا ہو کر سگریٹ نوشی کا عادی ہو جائے تو اس کا باپ بیٹے کی تربیت میں خامی سے کیسے بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہی حال بے نماز، رشوت خور، جھوٹ بولنے والے، وعدہ خلافی کرنے والے، گالی گلوچ اور بدزبانی کرنے والے، روزے نہ رکھنے والے اور زکوٰۃ نہ دینے والے والدین کا ہے۔ اگرچہ یہ گناہ ذاتی نوعیت کے ہیں لیکن اولاد کے معاملے میں ان کی تاثیر متعدی ہو جاتی ہے۔

بچے اپنے والدین کو جس رویے اور جن مشاغل میں دیکھیں گے وہ ان سے کیسے متاثر نہ ہوں گے! لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ والدین بچوں کو زبانی وعظ و نصیحت بھی کریں مگر اہم تر بات یہ ہے کہ وہ انہیں اپنی شخصیت کا نمونہ پیش کر کے ان پر واضح کریں کہ کیا چیز پسندیدہ ہے اور کیا چیز ناپسندیدہ، کون سے کام کرنے کے ہیں اور کون سے اجتناب کرنے کے قابل ہیں۔ اس طرح بڑی حد تک توقع کی جا سکتی ہے کہ بچے ہمہ گیر تربیت پائیں اور اچھے شہری اور اچھے مسلمان ثابت ہوں۔ چنانچہ اس تحریر کا مدّعا یہ ہے کہ والدین اپنے فرائض سے واقف ہوں اور

ان کی ادائیگی کے سلسلے میں چوکس ہوں۔ جبکہ اولاد کو فرائض کی ادائیگی کا احساس دلانا بھی ضروری ہے، مگر وہ اس کے بعد کی بات ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، والدین کو حسنِ عمل اور حسنِ اخلاق کی عملی مثال پیش کرنا سب سے ضروری ہے۔ اس کے لیے اپنے فرائض کو ہر وقت ذہن میں مستحضر کرنا لازم ہے۔ یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اولاد کی تربیت بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ کیونکہ اچھی، صالح اور نیک اولاد صدقہ جاریہ کے درجے میں آتی ہے اور اُس کے نیک اعمال کا ثواب والدین کو بھی ملتا رہتا ہے چاہے وہ وفات بھی پا جائیں۔ اسی طرح اگر ماں باپ نے اپنی اولاد کی تربیت میں کوتاہی کی ہوگی تو اولاد کی برائیوں کا گناہ بھی والدین کو لگاتار ملتا رہے گا، اگرچہ وہ فوت بھی ہو جائیں۔ پس مسئلے کی اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے آیئے حقوقِ اولاد یعنی والدین کے فرائض کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

میاں بیوی اللہ تعالیٰ سے نیک اور سعادت مند اولاد مانگیں۔ جیسا کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا قرآن مجید میں منقول ہے:

{رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً} (آل عمران:۳۸)

''اے میرے پروردگار! مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرما۔''

پھر جب اللہ تعالیٰ اولاد مرحمت فرمائے تو اُس کی پیدائش پر اس کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جائے۔ اس عمل کی برکت اور تاثیر سے بچہ اُم الصبیان کے ضرر سے محفوظ رہے گا۔ نیز اللہ کی توحید اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی پاکیزہ آواز اُس کے کانوں کے ذریعہ دل و دماغ تک پہنچ کر ضرور اپنا اثر دکھائے گی۔ بہتر ہے کہ پیدائش کے بعد بچے کو اللہ کے کسی مقبول اور صالح بندے کے پاس لے جائیں جو اُس کے لیے خیر و برکت کی دعا کرے۔ جب حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما ہجرت کر کے مدینہ آئیں تو قبا کے مقام پر اُن کے ہاں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی ولادت ہوئی۔ وہ بچے کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور بچے کو آپؐ کی گود میں ڈال دیا۔ آپؐ نے چھوہارہ منگوایا، اس کو چبایا، پھر اپنا لعابِ دہن اس کے مُنہ میں ڈالا اور تالو پر ملا، اس کے بعد اس کے لیے خیر و برکت کی دعا کی۔

بچے کی پیدائش اہل خاندان کے لیے خوشی اور مسرت کا موقع ہوتا ہے۔ ایامِ جاہلیت میں اس موقعے پر خوشی کے اظہار کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے تھے۔ اسلام نے اس فطری خوشی کے اظہار کو برقرار رکھتے ہوئے جاہلیت کے انداز ختم کر دیے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

كَانُوْا فِي الْجَاهِلِيَّةِ اِذَا عَقُّوْا عَنِ الصَّبِيِّ خَضَّبُوْا قُطْنَةً بِدَمِ الْعَقِيْقَةِ، فَاِذَا حَلَقُوْا رَأْسَ الصَّبِيِّ

وَضَعُوْهَا عَلٰی رَاْسِہٖ ، فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ : ((اجْعَلُوْا مَکَانَ الدَّمِ خَلُوْقًا)) (رواہ ابن حبان فی صحیحہ)

''زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا یہ دستور تھا کہ جب وہ بچے کا عقیقہ کرتے تو روئی کے ایک پھوئے میں عقیقہ کے جانور کا خون بھر لیتے' پھر جب بچے کا سر منڈوا دیتے تو وہ خون بھرا ہوا پھویا اس کے سر پر رکھ دیتے۔ (یہ جاہلانہ رسم تھی) رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بچے کے سر پر خون نہیں بلکہ اس کی جگہ خلوق (زرد رنگ کی خوشبو) لگایا کرو''۔

خَلوق ایک خوشبو کا نام ہے جو زعفران وغیرہ سے تیار کی جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ عقیقہ کا رواج جاہلیت میں بھی تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی اصلاح کر دی۔ لڑکے کی طرف سے دو بکرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرے کی قربانی کرنے کو کہا۔ اگر وسعت نہ ہو تو لڑکے کی طرف سے بھی ایک ہی قربانی کافی ہے۔ اس گوشت کے ساتھ عزیز و اقارب کی دعوت کی جائے اور کچھ گوشت مساکین و فقراء میں تقسیم کر دیا جائے۔ عقیقہ ملت ابراہیمی کے شعائر میں سے ہے۔ سنن الترمذی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے روایت ہے کہ:

عَقَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ عَنِ الْحَسَنِ بِشَاۃٍ وَقَالَ : ((یَا فَاطِمَۃُ احْلِقِیْ رَاْسَہٗ وَتَصَدَّقِیْ بِزِنَۃِ شَعْرِہٖ فِضَّۃً)) قَالَ : فَوَزَنَتْہُ فَکَانَ وَزْنُہٗ دِرْھَمًا اَوْ بَعْضَ دِرْھَمٍ)) (رواہ الترمذی)

''رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسنؓ کے عقیقہ میں ایک بکری کی قربانی کی اور آپؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے فرمایا: ''اس کا سر صاف کر دو اور بالوں کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کردو''۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ نے ان کا وزن کیا تو وہ ایک درہم کے برابر یا اس سے بھی کچھ کم تھے''۔

بچے کا نام رکھنا بھی ایک حق ہے' ایسا نام جو کسی اچھی شخصیت کے نام پر ہو یا اچھے معنی رکھتا ہو۔ نام بے تکا اور بے معنی نہ ہو کہ بڑا ہو کر بچہ اپنے نام کی وجہ سے شرمندگی محسوس کرے۔ مثلاً محمد بوٹا' پیراں دتہ' اروڑہ' گھسیٹا' علی بخش' عباد علی' شقنود وغیرہم۔ رسول اللہ ﷺ کے پسندیدہ نام عبدالرحمن اور عبداللہ ہیں' یعنی وہ نام جس میں اللہ کا بندہ ہونے کا مفہوم نکلتا ہو۔ انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ناموں پر نام رکھنا بھی پسندیدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَوَّلُ مَا یَنْحَلُ الرَّجُلُ وَلَدَہٗ اسْمُہٗ الْحَسَنُ اسْمَہٗ))(رواہ ابوالشیخ' بحوالہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانی)

''آدمی اپنے بچے کو سب سے پہلا تحفہ نام کا دیتا ہے' اس لیے چاہیے کہ اس کا اچھا

نام رکھے۔''

اب بچے کی تربیت کا آغاز ہوتا ہے۔ جسمانی نشوونما کے لیے بچے کو اپنے وسائل کے اندر رہتے ہوئے اچھی غذا اور خوراک جو حلال او رجائز طریقے سے کمائی گئی ہو' مہیا کرنے کا بندوبست کیا جائے۔ بچہ تو معصوم ہے' اس کو تو جو ملے گا کھالے گا' مگر والدین خصوصاً والد کا یہ بڑا اہم فرض ہے کہ وہ روزی کمانے کے جائز ذرائع اختیار کرے۔ یہ تربیت اولاد کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ رزقِ حلال پر پرورش پانے والے بچے عموماً صاف ستھرے اخلاق و کردار کے مالک' والدین کے فرماں بردار' بزرگوں کا احترام کرنے والے اور راست رو ہوتے ہیں۔

جب بچہ بولنے کا آغاز کرے تو سب سے پہلے اسے کلمہ طیبہ سکھایا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِفْتَحُوْا عَلٰی صِبْیَانِکُمْ اَوَّلَ کَلِمَۃٍ بِلَا اِلٰـہَ اِلاَّ اللّٰہُ وَلَقِّنُوْھُمْ عِنْدَ الْمَوْتِ لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہُ)) (شعب الایمان)

''اپنے بچوں کی زبان سے سب سے پہلے لا الٰہ الاّ اللہ کہلوائو اور موت کے وقت ان کو اسی کلمہ لا الٰہ الاّ اللہ کی تلقین کرو۔''

جس طرح پیدائش کے بعد پہلی آواز بچے کے کان میں جو ڈالی جاتی ہے وہ اذان کے الفاظ ہیں' اسی طرح جب اس کی گفتگو کا آغاز بھی کلمۂ توحید سے ہو گا تو اس کا اس کے قلب و ذہن پر اثر ضرور ہو گا۔ آج کے مغرب زدہ دور میں مسلمان بچوں کو زیادہ سے زیادہ انگریزی الفاظ سکھانے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے بچے کے ذہن پر اس زبان کی برتری غالب ہو کر اسے مغربی اقدار سے قریب اور اسلامی اقدار سے دور کرنے لگتی ہے۔

بچے کا سب سے پہلا مدرسہ اس کی ماں کی گود ہوتی ہے۔ اگر ماں پاکیزہ اخلاق و کردار کی مالک' سادگی پسند' مشرقی اقدار و روایات کی شائق اور اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والی ہو گی تو بچہ یہی باتیں خود بخود سیکھ جائے گا۔ اس کے برخلاف اگر ماں فیشن کی دلدادہ' موسیقی کی شوقین' بے پردگی کی عادی اور اسلامی روایات سے نفور ہو گی تو بچہ بھی

انہی اقدار کو پسند کرے گا اور اپنائے گا۔ لہٰذا بچے کی تربیت میں ماں کا کردار باپ سے بھی زیادہ تأثیر رکھتا ہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے: ؎

بتولے باش وپنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

''اے مسلمان عورت ! تو بتول (حضرت فاطمہؓ) کا کردار اپنا کر زمانے کی آنکھوں سے مستور زندگی گزار(یعنی باپردہ رہ)۔ پھر دیکھ تیری گود میں بھی حسینؓ پرورش پائے گا''۔

جو عورت حیا باختہ کردار و عمل کی مالک ہو اور ستر و حجاب کی پابندیوں کا مذاق اڑاتی ہوئی سر کے بال کھولے کلبوں' پارکوں' گلیوں اور بازاروں میں گھومے اس کی گود میں اسلامی اقدار سے محبت رکھنے والی اولاد کیسے پل سکتی ہے؟ آج ہم اس بات کی خواہش تو ضرور کرتے ہیں کہ ہمارے بچے سعادت مند اور باکردار ہوں مگر اس سلسلہ میں عائد فرائض کی ادائیگی سے اعراض کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ یہ تو وہی بات ہے کہ نیم کا پودا لگا کر کوئی شخص آم کھانے کی تمنا کرے۔

رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق مسلمان اور کافر کے درمیان نماز کا فرق ہے۔ لہٰذا نماز کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے بچوں کو نماز کا عادی بنانا بھی والدین کا فرض ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مُرُوْا اَوْلَادَکُمْ بِالصَّلَاۃِ وَھُمْ اَبْنَائُ سَبْعِ سِنِیْنَ وَاضْرِبُوْھُمْ عَلَیْھَا وَھُمْ اَبْنَائُ عَشْرٍ وَفَرِّقُوْا بَیْنَھُمْ فِی الْمَضَاجِعِ)) (سنن ابی داؤد)

''تمہارے بچے جب سات سال کے ہو جائیں تو ان کو نماز کی تاکید کرو اور جب دس سال کے ہو جائیں تو نماز میں کوتاہی کرنے پر ان کو سزا دو اور ان کے بستر بھی الگ کر دو۔''

یہاں یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ اگر ماں باپ دونوں نماز کے پابند ہوں تو بچے خود ہی ان کو دیکھ کر نماز پڑھنے لگیں گے اور مار پیٹ کی نوبت کم ہی آئے گی۔ اس کے برعکس اگر خود ماں باپ نماز کی اہمیت سے غافل ہوں تو وہ اولاد کو نماز کی ترغیب کیسے دیں گے !

اور بالفرض ایسے والدین اولاد کو نماز کی تاکید کریں تو اس کا اثر اولاد پر کیسے ہو سکتا ہے ! اس لیے یہ ضروری ہے کہ والدین اچھی باتوں میں خود اپنا عملی نمونہ پیش کریں۔

والدین کے فرائض میں ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ وہ بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ مساوی سلوک کریں۔ بیٹے کے ساتھ برتری کا سلوک اور بیٹی کو گھٹیا سمجھنا مناسب نہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں لڑکی کی پیدائش پر غمی اور افسردگی کا اظہار کیا جاتا ہے اور لڑکے کی پیدائش پر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں غیر اسلامی اور غلط رسومات کے طومار کی وجہ سے لڑکی کی شادی کرنا بہت ہی مشکل بنا دیا گیا ہے۔ لمبے چوڑے جہیز کا انتظام لڑکی کے والدین کو کرنا ہوتا ہے' جبکہ لڑکے والوں کی طرف سے آنے والی بارات کے افراد کی خاطر تواضع بھی انہی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ لہٰذا جو شخص یہ اخراجات برداشت نہیں کر سکتا اسے بیٹی کی پیدائش پر یہ

فکر دامن گیر ہوجاتی ہے کہ اس کی رخصتی کیسے ممکن ہو سکے گی۔ مگر یہ طوق و اغلال خود ساختہ بوجھ ہیں جو ہم لوگوں نے ہندو معاشرے سے اخذ کر رکھے ہیں۔ اگر آج ہم نکاح کا اسلامی طریق کار اپنا لیں' یعنی جہیز اور بارات کو ختم کر دیں تو بیٹی کی پیدائش پر رنجیدہ ہونے کا کوئی سوال ہی نہ ہو۔ ہمیں یہ بات سمجھنی چاہیے کہ بیٹی کی پیدائش پر غم اور ناراضی کا اظہار تو کفار کا طریقہ ہے' جو بعض اوقات تو بیٹی کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیتے تھے۔ بالفاظِ قرآنی:

{وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُہُمۡ بِالۡاُنۡثٰی ظَلَّ وَجۡہُہٗ مُسۡوَدًّا وَّ ہُوَ کَظِیۡمٌ ﴿۵۸﴾ یَتَوٰرٰی مِنَ الۡقَوۡمِ مِنۡ سُوۡٓءِ مَا بُشِّرَ بِہٖ ؕ اَیُمۡسِکُہٗ عَلٰی ہُوۡنٍ اَمۡ یَدُسُّہٗ فِی التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا یَحۡکُمُوۡنَ ﴿۵۹﴾} (النحل)

''اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کے پیدا ہونے کی خبر سنائی جاتی ہے تو وہ سیاہ رو ہو جاتا ہے اور جی میں گھٹتا رہتا ہے' لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اس بری خبر کی وجہ سے جو اسے ملی ۔ سوچتا ہے کیا اس نومولود بچی کو ذلت کے ساتھ باقی رکھے یا اس کو کہیں لے جا کر مٹی میں دبا دے۔ سن رکھو! بہت برا ہے یہ فیصلہ جو یہ کرتے ہیں۔''

کفارِ مکہ کے اس ظالمانہ انداز کے برعکس اسلام میں بیٹی کی پیدائش کو مبارک سمجھا

جاتا ہے اور بیٹیوں کے ساتھ حسن سلوک اور اُن کے حقوق کی ادائیگی پر جنت کی خوشخبری دی گئی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنِ ابْتُلِیَ مِنَ الْبَنَاتِ بِشَیْءٍ فَاَحْسَنَ اِلَیْھِنَّ کُنَّ لَہٗ سِتْرًا مِنَ النَّارِ)) (رواہ البخاری و مسلم)

''جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیٹیوں کی ذمہ داری ڈالی گئی اور اُس نے اُن کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو یہ بیٹیاں اس کے لیے دوزخ سے بچاؤ کا سامان بن جائیں گی۔''

اسی طرح مسلم شریف میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ عَالَ جَارِیَتَیْنِ حَتّٰی تَبْلُغَا جَاءَ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ اَنَا وَھُوَ)) وَضَمَّ اَصَابِعَہٗ

''جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائیں تو وہ شخص اور میں قیامت کے دن اس طرح ہوں گے۔ (یہ کہتے ہوئے) آپؐ نے ہاتھ کی انگلیوں کو ملا کر دکھایا''۔

رسول اللہ ﷺ کے ان فرمودات سے معلوم ہوا کہ بیٹیوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی پرورش اور پھر نکاح والدین کی بخشش کا باعث بن جائیں گے۔ اس طرح بیٹی قابل نفرت اور حقیر نہیں بلکہ باعث برکت و رحمت اور اللہ کی نعمت ہے۔ اسلامی معاشرے میں تو اس عورت کو مبارک سمجھا جاتا ہے جس کے ہاں پہلی پیدائش بیٹی کی ہو۔

موجودہ دور میں ایک بُرائی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ والدین زیادہ اولاد سے گھبراتے ہیں۔ اگر اس گھبراہٹ کا

سبب یہ ہے کہ اولاد کا معاشی بوجھ کیسے برداشت ہو گا' تو یہ ذہنیت سراسر اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے' کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

{وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾} (بنی اسراءیل)

''اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم اُن کو رزق دیں گے اور تم کو بھی دے رہے ہیں ۔ بے شک ان کا قتل بہت بڑا گناہ ہے۔''

پس افلاس و ناداری کے باعث کثرتِ اولاد سے نفرت تو کسی صورت جائز نہیں' کیونکہ یہ

تو اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر عدم اعتماد ہے' البتہ کوئی اور وجہ مثلاً عورت کی کمزور صحت یا موت کا خطرہ ہو تو اور بات ہے۔

والدین پر ایک ذمہ داری یہ بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کے ساتھ برابری کا سلوک کریں۔ نہ بیٹے کو بیٹی پر ترجیح دیں اور نہ ہی کسی ایک بیٹے کو یا بیٹی کو دوسری اولاد سے برتر جانیں۔ اسی طرح داد و دہش میں بھی سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں جب کوئی ایسا واقعہ پیش آیا کہ کسی ماں نے یا باپ نے اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو کچھ ہبہ کرنا چاہا تو آپؐ نے اس کی اجازت نہیں دی اور فرمایا:

((اِعْدِلُوْا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ)) (رواہ البخاری)

''اپنی اولاد کے مابین مساوات اور برابری کو ملحوظ رکھو''۔

اس طرح کا سلوک ظلم و جور سمجھا گیا ہے۔ البتہ اولاد میں سے اگر کوئی بیٹا یا بیٹی کسی واقعی عذر کی بنا پر ترجیحی سلوک کے مستحق ہوں تو اُن کے ساتھ خصوصی معاملہ فقہائے کرام کے نزدیک جائز ہے۔ مثلاً ایک بیٹا جسمانی معذوری یا کسی اور وجہ سے روزی کے معاملے میں خود کفیل نہیں ہے تو اگر والدین اُس کی مالی امداد کرتے ہیں تو نہ یہ عدل و انصاف کے خلاف ہے نہ ہی ناجائز و مکروہ ہے' بلکہ یہ تو حسن سلوک کے درجہ میں اجر و ثواب کا باعث ہو گا۔ اسی طرح اگر کسی خاص وجہ کی بنیاد پر دوسرے بھائی بہن کسی ایک بہن یا بھائی کے ساتھ خصوصی سلوک پر رضامند ہوں تو بھی والدین کے لیے یہ جائز ہے اور گناہ کی بات نہیں۔

والدین کی ایک یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ اولاد میں سے کسی کو جائیداد سے محروم نہ کریں۔ یہ فطری بات ہے کہ ساری اولاد ایک جیسی نہیں ہوتی۔ کچھ کے معاملہ میں اُن کی فرمانبرداری' خدمت اور خوش اطواری کے سبب والدین کا جھکاؤ زیادہ ہوتا ہے' جبکہ کچھ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت برتتے ہوں'

بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بداطوار اور بدعمل بھی ہوں۔ ظاہر ہے ایسی اولاد سے اچھے والدین ناخوش ہوں گے اور اس ناراضی کے سبب اُن کا دل چاہے گا کہ انہیں کسی طرح کا فائدہ نہ پہنچایا

جائے۔ مگر اسلامی تعلیمات کی رو سے کوئی باپ یا ماں اپنے بیٹے یا بیٹی کو بداطواری اور بدکرداری کی بنا پر جائیداد سے محروم نہیں کر سکتے۔ آئے دن اخبارات میں مسلمان ماں باپ کی طرف سے اپنی مسلمان اولاد کو وراثت سے محرومی کے اعلان یعنی عاق نامے شائع ہوتے رہتے ہیں جن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں' بلکہ اولاد میں سے اچھے برے سب ہی افراد اپنے ماں باپ کی وراثت سے حصہ پائیں گے۔ کسی ماں یا باپ کو اپنی اولاد کو وراثت سے محروم کرنے کا حق نہیں۔ البتہ اگر کوئی ناہنجار بیٹا یا بیٹی اپنے ماں یا باپ کو قتل کر دے تو وہ خود بخود اُن کی وراثت سے محروم ہو جائے گا۔

والدین کا فرض ہے کہ جب بیٹا یا بیٹی شادی کی عمر کو پہنچ جائیں تو اُن کے نکاح کا انتظام کریں۔ کیونکہ یہ انسان کی فطری ضرورت ہے اور فطری ضروریات کو پورا کرنے سے نہ اسلام روکتا ہے اور نہ بے جا پابندی لگاتا ہے۔ لہٰذا پسندیدہ یہ ہے کہ بالغ ہونے کے فوراً بعد شادی کر دی جائے۔ اس سلسلہ میں اگر والدین کی غفلت کے سبب اولاد غلط راستے پر چل نکلے تو ذمہ داری والدین پر عائد ہو گی اور وہ مجرم ٹھہریں گے۔ شعب الایمان میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ وُلِدَ لَہٗ وَلَدٌ فَلْیُحْسِنِ اسْمَہٗ وَاَدَبَہٗ فَاِذَا بَلَغَ فَلْیُزَوِّجْہُ فَاِنْ بَلَغَ وَلَمْ یُزَوِّجْہُ فَاَصَابَ اِثْمًا فَاِنَّمَا اِثْمُہٗ عَلٰی اَبِیْہِ))

''جس کے ہاں اولاد ہو تو اسے چاہیے کہ اس کا اچھا نام رکھے' اور اُسے اچھی تربیت دے' پس جب وہ بالغ ہو جائے تو اُس کی شادی کرے' اگر شادی کی عمر کے پہنچ جانے کے باوجود اس کی شادی نہ کی گئی اور وہ گناہ میں مبتلا ہو گیا تو اُس کے گناہ کی ذمہ داری اس کے باپ پر ہو گی''۔

موجودہ دور میں دیر سے شادی کرنے کا رواج ہو گیا ہے اور یہ اس قدر معروف ہو گیا ہے کہ اگر کوئی باپ اپنے بیٹے یا بیٹی کا نکاح سولہ سترہ سال کی عمر میں کر دے تو اُس پر سخت نکتہ چینی کی جاتی ہے اور تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ بات ہماری اسلامی اقدار سے عدم واقفیت اور لاعلمی کو ظاہر کرتی ہے۔ یا یہ کہ ہم خود اپنی اقدار کی بجائے دوسری اقوام کی

اُن روایات کے شیدائی ہوتے جا رہے ہیں جو گھناؤنے جرائم کا باعث بن کر گندگی پھیلا رہی ہیں۔ ابن ماجہ میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَکرِمُوا اَوْلَادَکُمْ وَاَحْسِنُوا اَدَبَھُمْ))

''اپنی اولاد کا اکرام کرو اور ان کو حسن آداب سے آراستہ کرو''۔

یعنی اولاد کو عطیہ خداوندی اور انمول نعمت جان کر ان کی قدر کرنی چاہیے۔ اولاد کی تربیت کو اہم ذمہ داری سمجھ کر اس کی طرف بھرپور توجہ دینی چاہیے۔ دنیاوی مصروفیتوں' فضول مشغلوں اور معاشی دوڑ دھوپ میں گم ہو کر تربیت اولاد کے سلسلہ میں غفلت انتہائی غیر ذمہ داری ہے۔ اس حدیث میں اسی بات کو مثبت انداز میں بیان فرما کر اس کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

پس اگر والدین اپنے فرائض کی ادائیگی بطریق احسن کریں تو بڑی حد تک توقع کی جا سکتی ہے کہ اُن کی اولاد بھی ان کے حقوق پورے کرے گی اور خاندانی نظام میں بہتری پیدا ہو گی جس کے نتیجہ میں صحت مند مسلم معاشرہ قائم ہو کر خیر و برکت کا باعث ہو گا۔